نسٹیئن

2015

جلد: 5

نیشنل یونیورسٹی آف سائنسز اینڈ ٹیکنالوجی کا ادبی مجلّہ

سرپرست

انجینئر محمد اصغر

ریکٹر نسٹ

مجلِس مشاورت

انجینئر محمد شاہد

پرو ریکٹر

ڈاکٹر آصف رضا

پرو ریکٹر

ڈاکٹر صفدر علی شاہ

ڈائریکٹر پبلشنگ اینڈ سٹوڈنٹ افیئرز

مدیر

احسان الحق

ڈپٹی ڈائریکٹر سٹوڈنٹ افیئرز

مدیر طلباء

لئیقہ عندلیب، مومنہ ابرار رشید

ترتیب وتزئین: ندیم شہزاد

ناشر: پبلشنگ اینڈ سٹوڈنٹ افیئرز ڈائریکٹوریٹ

نیشنل یونیورسٹی آف سائنسز اینڈ ٹیکنالوجی، اسلام آباد

طابع: **نسٹ پریس**

ترتیب

اداریہ		7

پاکستانیات

ہمارا دینی اور ملّی فریضہ	ممتاز اقبال ملک	9
بول کہ لب آزاد ہیں تیرے	نعمان وحید	18
میں کشمیر ہوں	ذات الاکمال عباسی	19
جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی	محمد سالار ارشد	21
سوشلزم اور کمیونزم کی دوڑ میں پاکستان کا مقام	جاوید اختر	22

مضامین

ولیم شیکسپیئر	پیر اکرم	23
نسخہ شادمانی	اسلم بزمی	31
پاکستانی تاریخ کے دو سولہ دسمبر	ڈاکٹر محمد حنیف	44
اقبال کا فلسفۂ خودی	عماد الدین	45
شاندار دلیل	ارسلان ارشد	46
مجھے کچھ نہیں آتا	ارسلان ارشد	47

اقبالؒ کا تصورِ خودی	احمد عبداللہ	48
ردائے بے ثمر	امینہ فلک شیر	50
حاصل یا لاحاصل	جہانزیب اکرم	51
محبت فاتحِ عالم	انعم زہرہ	53

مزاح

رٹّے کی اہمیّت	انعم زہرہ	55
پھر سے وہ ہو گیا جس کا ڈر تھا!	سارہ سُلطانہ	57
کھٹی میٹھی باتیں	صفدر علی	58

افسانہ

گھونسلا	مخدوم محمد شہاب الدین	59

منظومات

حمدِ باری تعالیٰ	اسلم بزمی	61
نماز	محمد عثمان اختر	62
ٹریننگ لائف	محمد فراز	64
اے میرے دلِ ناداں	محمد فراز	64
اُف یہ پڑھائی	عمادالدین اظہر	65

ماں	محمد حمزہ سُہیل	66
حقیقی کامیابی کا پیغام	محمد ثقلین	67
عہدِ وفا	فرخ اقبال	68
حقیقت	سید شوزیب عباس	69
شہیدِ وطن	سعدیہ حسنین شاہ	70
وطن کی حفاظت	محمد حسین فاروق شان	71
مجھ پر کچھ لکھو	احسن وحید	72
نظم	نویرا طاہر	73
غزل	مخدوم محمد شہاب الدین	74
غزل	فہم بن خالد	75

ہمارے ادارے

College of E&ME	کالج آف الیکٹریکل اینڈ میکینکل انجینئرنگ
MCE	ملٹری کالج آف انجینئرنگ
MCS	ملٹری کالج آف سگنلز
PNEC	پاکستان نیوی انجینئرنگ کالج
CAE	کالج آف ایرونا ٹیکل انجینئرنگ
SCEE	سکول آف سول اینڈ انوائرمنٹل انجینئرنگ
SEECS	سکول آف الیکٹریکل انجینئرنگ اینڈ کمپیوٹر سائنس
SCME	سکول آف کیمیکل اینڈ مٹیریلز انجینئرنگ
SMME	سکول آف میکینکل اینڈ مینوفیکچرنگ انجینئرنگ
NBS	نسٹ بزنس سکول
ASAB	عطاء الرحمان سکول آف اپلائیڈ بائیو سائنسز
RCMS	ریسرچ سینٹر فار ماڈلنگ اینڈ سیمولیشن
SNS	سکول آف نیچرل سائنسز
NIPCONS	نسٹ انسٹیٹیوٹ آف پیس اینڈ کانفلکٹ سٹڈیز
SADA	سکول آف آرٹ، ڈیزائن اینڈ آرکی ٹیکچر
USP CASE	یو ایس پاکستان سینٹر فار ایڈوانس سٹڈیز اِن انرجی
CIPS	سینٹر فار انٹرنیشنل پیس اینڈ سٹیبلٹی
S^3H	سکول آف سوشل سائنسز اینڈ ہیومینیٹیز

ادب کا تعلق احساسات کی تلچھٹ سے ہے اور سائنس کا تعلق دماغ کی اختراعات سے عبارت سمجھا جاتا ہے۔ اب اگر یہ سمجھا جائے کہ ادب اس مقابلے میں سائنس سے مات کھا جاتا ہے تو یہ محض ہماری کج خیالی ہے کیونکہ دماغ کے بہت بڑے حصے کا تعلق احساسات سے ہے، انسان کی محسوسات ہی اس کے جینے کا انداز متعین کرتی ہیں۔ احساسات کی کہانی خاصی طویل ہے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ سائنس کا ہاتھ ادب سے اوپر ہے اور ادب سائنس کی مرہونِ منت ہے تو آئن سٹائن جیسا زیرک سائنسدان، ادب کے زعیم ڈاکٹر علامہ محمد اقبال سے ملنے پر کیونکر راضی ہوا۔ کیوں فلسفہ اور سائنس کو ایک مقام پہ اکٹھا ہونا پڑا؟ اِس کا جواب یہی ہے کہ سائنس اور ادب ایک دوسرے کی احتیاجات ہیں۔ جو چیز سائنس دان دیکھ نہیں سکتا، ادیب اپنے دل کی آنکھ سے محسوس کر سکتا ہے۔

اردو ادب نے جس طرح کے انمول نگینے دنیا کو عطا کیے، وہ ایشیا تو کیا شاید ہی دنیا کی کسی اور زبان کا ادب پیدا کر سکا ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے جو 20/19 کا شاعر ہے، زندگی کے ہر شعبے سے متعلق منظومات لکھ کر جو کارنامہ سرانجام دیا ہے، اِس کی مثال دنیا کی کسی زبان کے ادب میں نہیں ملتی جبکہ عمومی طور پر یہی سمجھا جاتا رہا ہے کہ اُردو زبان میں فلسفیانہ شاعری غالبؔ کی دریافت ہے جو کہ انیسویں صدی کا شاعر ہے۔ اِس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اُردو زبان نے اپنے ارتقاء کے اوائل میں ہی اپنی وسعت اور اہمیت کا لوہا منوا لیا تھا۔ آج بھی اگر ہم نظیرؔ کی فلسفیانہ منظومات پر نظر دوڑائیں تو ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور فنا اور بقا کی جنگ کی بازگشت دور تک سنائی دیتی ہے۔

نسٹیئن کا کوئی بھی صفحہ اٹھا کر دیکھ لیا جائے ایک چیز جو صاف طور سے محسوس کی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ خواہ الفاظ کی کمی ہو لیکن جذبات کی ایک آتش ہے جو آخری صفحے تک تجسس کو

مٹنے نہیں دیتی۔ ہر سال تحاریر کا ایک پلندہ اور ہر تحریر ایک نئے جذبے کی عکاسی کرتی ہے' مزے کی بات یہ ہے کہ ان تحاریر کے بارے میں کبھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی رسالے میں گنجائش نہیں اور ہر شعبے کا نسٹئین رسالے میں موجود ہونا اس فیصلے کو مشکل تر کر دیتا ہے کہ کس تحریر کو شامل کیا جائے اور کسے رد کیا جائے۔

تجسس نے انسان کو چاند پر پہنچا دیا، آسمان سے باتیں کرتی ہوئیں عمارات کا معمار بنا دیا اور سمندروں کی تہہ تک پہنچا دیا۔ ہر انسان کے احساسات اُس کی میراث ہیں، یہ اُس کی ذات کا وہ حصہ ہے جو کبھی ناکارہ نہیں ہوسکتا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ترقی کے اس دور میں احساسات کی اس میراث کو ٹیکنالوجی کے ہاتھوں مجروح نہ ہونے دیا جائے۔ نسٹئین نسٹ کے مستقبل کے ستاروں کی اس میراث کی جس طرح سے پاسبانی کرتا ہے اس کی مثال گزشتہ شماروں کا مطالعہ کر کے بخوبی دیکھی جا سکتی ہے اور یہ شمارہ بھی اِنہیں ستاروں کی جگمگاتی میراث سے مزیّن ہے۔

میں مشکور ہوں طالب علم مدیر لئیقہ عندلیب کا جس نے ''دی نسٹئین 2015'' کی اصلاح کرنے میں میری بھرپور اعانت کی۔ میں خصوصی طور پر شکر گزار ہوں جناب اسلم بزمی اور صفدر علی خان کا۔ ان کی نگارشات نے اس شمارے کے حجم اور کوالٹی میں اضافہ کیا۔ ادیبہ رحمٰن نے بھی مسودّہ پڑھا اور اس کی بہتری کے لئے گراں قدر تجاویز دیں۔ اُمید ہے آئندہ بھی وہ اس سلسلے کو جاری و ساری رکھیں گی۔

قارئین کرام سے درخواست ہے کہ اپنی آراء سے آگاہ فرما کر ''دی نسٹئین'' کو بہتر بنانے میں ہماری معاونت فرمائیں۔

مدیر

ممتاز اقبال ملك

ہمارا دینی اور ملّی فریضہ

پاکستان اُس زمانے میں اسلام کے نام پر معرضِ وجود میں آیا' جب مادیّت والحاد اپنے عُروج پر پہنچے ہوئے تھے' اس کا مطلب ہے مذہب دشمن طاقتوں سے پاکستان کا ٹکراؤ لازمی تھا اور مزید یہ کہ دُنیا کا تحکّم ان ہی طاقتوں کے ہاتھ میں تھا۔ ایسے تاریخی اور نظریاتی پسِ منظر میں پاکستان کا ظہور حیران کُن ہے۔

یہ کیسے ظہور پذیر ہوگیا؟ اس پر غور کرنے سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے:

اوّل یہ کہ ایسے زمانے میں بھی جب مذہب زوال پذیر ہو چکا تھا' اسلام کی اپنے نام لیواؤں کے دلوں پر گرفت اتنی مضبوط تھی کہ وہ اُن سے تحریکِ پاکستان جیسی یکسر اسلامی جِدّ وجُہدِ آزادی برپا کرا سکتا تھا۔

دوم یہ کہ برّصغیر کے مسلمانوں کا کچھ ایسا خصوصی کردار ضرور ہوگا کہ مسلمانانِ عالَم میں سے صرف ان ہی کو اسلام کا جھنڈا بلند کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔

برّصغیر کے مسلمانوں نے عالَمِ اسلام کی حیاتِ نَو میں کیا کردار ادا کیا؟ اس کا تھوڑا سا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے جو مولانا محمد علی جوہرؒ نے ایک تقریر میں بتائی تھی۔ انہوں نے کہا: ''رؤف بے نے' جو صلح لوزاں کے وقت ترکیہ کے وزیرِ اعظم تھے' مسلمانانِ برّصغیر کے وفد کے ایک رُکن ڈاکٹر انصاری سے کہا کہ اس صلح نامے پر دستخط سے پہلے ہمیں کئی بار مایوسیوں کے ایسے مرحلوں سے گزرنا پڑا کہ جی چاہتا تھا مغربی طاقتیں جو شرائط بھی رکھیں' ہم اُن کو مان لیں' لیکن پھر ہمیں خیال آتا تھا کہ ہم برّصغیر کے مسلمانوں کو کیا منہ دکھائیں گے جنہوں نے ہماری خاطر کتنی بڑی مصیبتیں برداشت کی ہیں۔''

اِس خصوصی کردار کے کئی عوامل ومحرکات ہیں' مثلاً اسلام کو ہندومت سے زیادہ متضاد و متناقص تہذیب سے کہیں اور پالا نہیں پڑا۔ نصرانیّت اور یہودّیت بہرحال ایک ہم جنس حلقۂ فکر وخیال سے تعلق رکھتی تھیں۔ عیسائی اور یہودی اہلِ کتاب تھے' انہوں نے خالقِ حقیقی کے تصوّر کو مسخ کر دیا تھا اور کلامِ الٰہی میں تحریف و تبدّل کر دیا تھا۔ مُسلمان ملکوں میں مختلف مذاہب کے پیروؤں میں کوئی خاص تہذیبی فرق بھی نمایاں نہ تھا۔ غیر مُسلم بھی عربی بولتے تھے' وہی لباس پہنتے تھے اور اُن سے پورے معاشرتی روابط جاری تھے' حتیٰ کہ اُن کی عورتوں سے شادی کی بھی اجازت تھی لیکن ہندوستان میں مسلمانوں کو ایک قطعی نئی مخلوق سے واسطہ پڑا۔ وہ نہ صرف ایک عجیب وغریب تہذیب کی حامل تھی بلکہ اس پر بہت نازاں بھی تھی اور غیروں سے میل جول کی روادار نہ تھی۔ جہاں ہندو سماج ذاتوں میں منقسم تھا' وہاں وہ دوسری تہذیبوں سے بالکل جدا تھا اور خارجی عناصر کو اپنے اندر جذب یا ہڑپ کرنے کے قابل ہی نہ تھا۔ مسلمانوں کو ملیچھ کے لقب سے پکارتا تھا۔ وہ اُن عناصر سے' جو اسلام اختیار کر کے ہندو سماج سے کٹ جاتے' کسی قسم کا رشتہ نہ رکھتا تھا۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی اور ہندو تہذیبوں میں کبھی کوئی قدرِ مشترک پیدا نہ ہوئی' اور وہ دونوں اپنے اپنے دائروں میں رواں دواں رہے۔ اِس طرح نہ صرف

اُن کا جُدا گانہ تشخص برقرار رہا بلکہ ان میں ایک دوسرے کے لیے اس قسم کے جذبات موجزن رہے جو لاتعلقی اور دُوری کا سمندر بن گئے۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کے اقتدار کو کبھی نہیں بُھلایا۔ جب موقع پایا' اُن کے خلاف بغاوت اور غداری کی۔ انگریزوں کے آنے پر مسلمانوں نے باوجود اُس فیاضانہ سرپرستی کے' جس سے انہوں نے ہندوؤں کو نوازا' کبھی ہندوؤں پر اعتبار نہیں کیا۔ اسی طرح جہاں ایک طرف مسلمانوں کی زندگی قطعی اسلامی افکار و اقدار کے سانچے میں ڈھلی' دوسری طرف ان کا اسلامی کردار پختہ ہوتا گیا۔ اسلام ان کا مذہب ہی نہ تھا بلکہ وہ ان کی سیاست' مملکت اور وطن بھی تھا۔ اسلام کے حوالے کے بغیر ان کی زندگی کی چھوٹی سی چھوٹی جزئیات طے نہ ہوسکتی تھیں۔ علاّمہ اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ جہاں اسلام مسلمانوں کے معاشرے کا ناظمِ اعلیٰ اور عامل اوّل ہے' وہاں اس نے جس طرح اپنے اس کردار کو ہندوستان کے مسلمانوں کی شخصیت کی تشکیل میں ادا کیا' کہیں اور نہیں کیا۔ برّصغیر کے مسلمان اس وجہ سے بھی مسلمانانِ عالَم میں ممتاز تھے کہ ان کا سامنا ہندو مت اور ہندوؤں سے تھا جس نے ان کی اسلامی شناخت کے احساس کو نئی قوت بخشی۔

جب تک برّصغیر پر انگریزوں کی حکومت رہی' مسلمان اور ہندو خارجی طاقت کے زیرِ نگیں تھے۔ ان میں ایک فرق یہ تھا کہ جہاں ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف انگریز کی سرپرستی حاصل ہوئی تھی' وہاں مسلمانوں نے فطری طور پر اس نئی طاقت کی مخالفت کی تھی جس نے ان سے اقتدار چھینا تھا۔ اسی لیے جہاں ہندوؤں نے انگریزوں کی تہذیبی بالادستی کو تسلیم کر کے ترقی کی' وہاں مسلمانوں نے نئی تعلیم و تہذیب کو مسترد کر کے اپنے لئے انگریز کے اچھے سلوک کے تمام راستے بند کر لیے' لیکن انگریزوں نے ہندوؤں کو جو سب سے بڑا تحفہ دیا' وہ تھا اصولِ اکثریت یعنی حکومت اکثریت بناتی ہے۔ اس اصول کا مطلب تھا کہ نہ صرف ہندوؤں کے لیے پورے برّصغیر پر حکومت کی راہ کُھلتی تھی' بلکہ انہیں مسلمانوں سے ان کی ہزار سالہ حکمرانی کا بدلہ لینے کا موقع بھی ملتا تھا' اس لیے ہندو نے انگریز کے تحفے کو بصد شکر قبول کیا اور وہی قوم جو کل تک مسلمان کو ملیچھ کا نام دیتی تھی' اب اس سے متّحدہ قومیّت کی پینگیں بڑھانے کو تیار ہوگئی۔ یہ قومیّت حقیقت پر مبنی نہ تھی' اس لیے ہندوؤں کی چال نہ چلی اور پھر مسلمانوں پر کچھ سیاسی میدانوں میں اشتراکِ عمل سے بھی بالکل واضح ہو گیا کہ مسلمانوں کی منزل کوئی اور ہی ہے۔

منزل کی نشان دہی مشکل نہ تھی۔ مسلم قوم اپنے مذہبی اور تہذیبی ورثے کو ایسے علاقے میں محفوظ رکھ سکتی تھی جہاں اسے مکمل بالادستی حاصل ہو' لیکن حالات یہ تھے کہ جہاں برّصغیر کو جغرافیائی' سیاسی اور انتظامی وحدت قرار دیا گیا تھا' وہاں انگریز اور ہندو نے اس کی وحدت کو تقدیس کا درجہ دیا ہوا تھا۔ ہندو ہندوستان کو گئو ماتا (اماں گائے) سے تعبیر کرتے تھے تاکہ وہ پورے علاقے پر اپنی اکثریت کے ذریعے قابض ہوسکیں لیکن انگریزوں نے یہ موقف اس لیے اختیار کیا تھا کہ انہوں نے دورِ حاضر کے مواصلات کی مدد سے برّصغیر کو فی الواقع ایک جغرافیائی اور انتظامی وحدت بنایا تھا' وہ مستقبل میں اسے ہندوؤں کے سُپرد کرنا چاہتے تھے تاکہ ان سے مل کر مشرقِ وسطیٰ کے مسلمانوں پر اپنا تسلط قائم رکھ سکیں۔ ان دو طاقتوں کا اشتراکِ مقصد اور اشتراکِ کار مسلمانوں کی راہ میں دیوار تھا۔ انگریز برّصغیر کی قسمت کے مختارِ کُل تھے' تو ہندو نہ صرف بھاری اکثریت میں تھے' بلکہ بڑی تنظیم کے مالک بھی۔ دونوں عناصر' یعنی طاقت اور نام نہاد جمہوریت' مسلمانوں کے خلاف کارفرما تھے۔ ان نامساعد اور صبر آزما حالات میں مسلمانوں نے پاکستان کو منزلِ مقصود قرار دیا۔ موجودہ زمانے

کی کوئی جدّ وجُہدِ آزادی اس سے زیادہ جانکاہ نہ ہوسکتی تھی۔ کسی ملک کے لوگوں کا استعمار کے خلاف کھڑا ہونا زمانے کی رَو کے مطابق تھا۔ دنیا کو آزادی کی جنگ لڑنے والوں سے ہمدردی تھی۔ برّصغیر کے ضمن میں امریکہ، روس اور یورپ بلکہ ساری دُنیا ہندو کانگرس کو تحریکِ آزادی کا علمبردار سمجھتی تھی اور گاندھی کی شخصیت اور پراپیگنڈے نے کانگرس کو برّصغیر کی آزادی کی علامت بنادیا تھا۔

اس پسِ منظر میں مسلمانوں کی تحریک عجب کشمکش سے دوچار تھی۔ پہلے تو انہیں اپنی الگ قومیّت کا وجود ثابت کرنا تھا۔ ہندوؤں کے نعرۂ متحدہ قومیّت نے مسلمانوں کے تاریخی تشخص کو دھندلا دیا تھا اور تحریکِ خلافت میں گاندھی کی شاطریّت سے مسلمان اور ہندو ایک ہی سیاسی پلیٹ فارم پر کھڑے نظر آتے تھے۔ ویسے بھی آزادی کی تحریکوں کا عام فہم مطلب یہی تھا کہ ایک جغرافیائی واحد ملک میں رہنے والے لوگ، خواہ وہ کسی بھی مذہب یا نسل سے تعلق رکھتے ہوں، خارجی حکمرانوں کے خلاف ملتِ واحدہ ہیں۔ مسلمانوں نے منفرد طرزِ عمل اختیار کیا۔ وہ جغرافیائی طور پر ایک واحد علاقے میں، جہاں خارجی طاقت انگریز تھے، ایک ایسی تحریک چلا رہے تھے جو ایک طرف اکثریت سے علیحدگی چاہتی تھی اور دوسری طرف بظاہر ایک متحدہ علاقے کو تقسیم کرنے کی دعویدار تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ نہ صرف انہیں داخلی طور پر ہندوؤں اور انگریزوں کی طاقتور مخالفت کا سامنا تھا، بلکہ خارجی طور پر انہیں کسی کی ہمدردی حاصل نہ تھی۔ جس راستے پر مسلمان گامزن ہوئے، وہ سخت کٹھن تھا، لیکن منزل جتنی کٹھن تھی، اتنا ہی وہ مسلمانوں کے اُس جوہر کو بروئے کار لانے میں مؤثر ثابت ہوئی جس جوہر نے ان کی شخصیت اور قومیت کو ہندوؤں سے بالکل مختلف بنایا تھا اور وہ تھا مسلمانوں کی اپنے مذہب سے وابستگی۔

> استاذِ محترم پروفیسر محمد منورؒ 1971ء میں مشرقی پاکستان میں حالات بے قابو ہوجانے کے دوران اور بعد ازاں تاحیات، اپنے اقبالی خطبات اور نظریاتی مجالس میں بار بار کہتے کہ ”جو قوم اپنی تاریخ کو فراموش کر دیتی ہے اُس کا جغرافیہ اُسے فراموش کر دیتا ہے“

پاکستان کا جسم اور روح اسلام سے سرشار ہیں۔ اقامتِ دین اس کی تخلیق کا مقصدِ اوّلیں ہے، لیکن جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا، جس فضا میں پاکستان نے آنکھ کھولی، وہ سراسر اُس کے اپنے فطری تقاضوں کی روشنی میں نشوونما کے خلاف تھی۔ وہ ایک ایسی آندھی تھی جو اس نرم و نازک بوٹے کے پلنے بڑھنے کے لئے زہر کا درجہ رکھتی تھی۔ یہ فضا اسلام کے لئے اتنی ناسازگار تھی کہ کئی مسلمان ملک بھی اسلام کو قصۂ ماضی سمجھ چکے تھے۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد امریکہ اور روس کی کشاکش نے مغرب کو کمیونزم سے متصادم کردیا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ جہاں امریکہ مذہب کا پاسبان ہے، وہاں درسِ مادیّت اور الحاد کا علمبردار بھی ہے۔ امریکہ اور روس کی آویزش واقعی مذہب اور لامذہبیت کی آویزش ہوتی، تو پھر سوال یہ ہے کہ امریکہ نے پچھلی جنگ میں جرمنی کے خلاف روس کا ساتھ کیوں دیا تھا، جب کہ ہٹلر مغرب کے لیڈروں سے اپیل کر رہا تھا کہ وہ کمیونزم کے خلاف اُس سے تعاون کریں؟ اس کے برعکس فرانس اور برطانیہ نے جرمنی کے خلاف فوراً محاذ بنایا اور کمیونسٹ روس سے دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ کچھ عرصے بعد امریکہ نے اس محاذ پر بھرپور طور پر شرکت کی اور روس سے مل کر جرمنی کو تہس نہس کردیا۔ اس اشتراکِ عمل کا نتیجہ ہے کہ جنگ کے بعد اللہ تعالیٰ کے منکر روس کے تحکم کی سرحدیں وسطِ یورپ سے آملیں اور شرقی یورپ اس کی سلطنت کا لازمی حصہ بن گیا۔ لازمی طور پر اس تاریخی پیش رفت کی وجوہ مذہبی عصبیت کے سوا کچھ اور ہی ہوں گی!

ان میں ایک وجہ تو یہی ہے کہ فرانس اور برطانیہ کو وسطِ یورپ میں جرمنی کی طاقت برداشت نہ تھی۔ اُن کے قومی مفاد کا تقاضا تھا کہ جرمنی اُن کے مقابلے میں کبھی اتنا طاقتور نہ بنے کہ ان کی سلطنتوں کو چیلنج کر سکے۔ یہ ان کا قوم پرستانہ موقف تھا۔ مغربی ملکوں کا اصل مذہب قومیّت پرستی ہے، نہ کہ عیسائیت۔ برطانیہ اور فرانس نے دو مرتبہ اپنے قومی مقاصد کے لیے امریکہ کو استعمال کیا اور وہ اُن کی جنگوں میں شریک ہوا، لیکن بالآخر یہ عمل اس امر پر منتج ہوا کہ اُن کی سلطنتیں قائم نہ رہیں۔ امریکہ یورپ پر چھا گیا اور جب امریکہ عالمی طاقت بنا تو اس نے یورپ کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ امریکہ اور روس کے مفادات ایک دوسرے سے متصادم تھے۔ ان میں جو سرد جنگ چھڑی، اسے نظریاتی رنگ دیا گیا۔ امریکہ کو مذہب کا علمبردار بتایا گیا، تو روس کو مادیّت کا، لیکن اس نظریاتی جنگ کی اصلیت اُس نظریاتی جنگ سے کچھ زیادہ نہ تھی جو ایک طرف برطانیہ اور فرانس اور دوسری طرف جرمنی کے درمیان ہوئی تھی اور جس میں اول الذکر ملکوں کو جمہوریّت کا علمبردار اور مؤخر الذکر کو فاشزم اور آمریّت کا نمونہ بتایا گیا تھا۔ وہ بھی مفادات کی جنگ تھی اور یہ بھی مفادات کی جنگ تھی، حقیقت یہ ہے کہ جرمنی کی نسل پرستی ہدفِ تنقید بنی تو وہ اس قوم پرستی کا نتیجہ تھی جو یورپ نے بطورِ مجموعی اختیار کی اور جس میں برطانیہ اور فرانس پیش پیش تھے، اسی طرح نظامِ حکومت کے سوا امریکہ اور روس کے فلسفۂ حیات میں بھی کچھ فرق نہیں۔ ہلسنکی کانفرنس نے اِس کا سب سے روشن ثبوت فراہم کیا جہاں 35 ملکوں نے امریکہ اور روس کی سرپرستی میں صلح و آشتی کا معاہدہ کیا اور یہ معاہدہ اس لیے ممکن ہوا کہ عربوں کے تیل کے بائیکاٹ اور ویت نام میں امریکہ کی شکست نے مغرب کی روس پر بالادستی کو ختم کر دیا۔ انہوں نے عافیّت اسی میں دیکھی کہ ایک بار پھر مشترکہ محاذ بنائیں، البتہ اس بار یہ مشترکہ محاذ باقی دنیا اور خاص طور پر عربوں اور چین کے خلاف بنایا جا رہا تھا۔

مطلب یہ ہے کہ مغرب اور روس میں کوئی ذہنی فاصلہ نہیں تھا۔ مارکس یورپ کی پیداوار تھا، مارکسزم کو لینن کے واسطے سے روس نے اسی طرح قبول کیا جس طرح پہلے وہ زاروں کے واسطے سے پیرس اور لندن کی یورپی تہذیب کو قبول و اختیار کر چکا تھا۔ مادیّت کی ابتدا یورپ سے ہوئی جہاں مذہب کو ایسا نچلا درجہ دیا گیا جس کا اس کے معاشرے کے عملی پہلوؤں یعنی معاشرت، معیشت اور سیاست سے کوئی تعلق نہ تھا۔ روس میں کمیونزم رائج ضرور تھا اور سیاسی نظام بھی مختلف، لیکن وہاں بھی چرچ کی گنجائش موجود تھی اور بالکل اسی طرح جس طرح مغرب میں۔ نہ مغرب میں چرچ کی کوئی وقعت تھی، نہ روس میں۔ جس جہت میں یورپی اقوام کی خصوصیت، یعنی قوم پرستی، پورے طور پر روس کے رگ و ریشہ میں رچ بس گئی۔

امریکہ اور مغرب کا مطمحِ نگاہ روس سے مختلف نہ تھا۔ کچھ کمی تھی، تو صرف مفادات کے اشتراک کی۔ امریکہ کے لیے عربوں کے تیل نے اور روس کے لیے چین کے خلاف مشرقی محاذ کی سنگینی نے اس کمی کو پورا کر کے اتحاد کے عوامل بھی پیدا کر دیے۔

پاکستان کا قیام برّصغیر کے مسلمانوں کی اس آرزو کا ثمر ہے کہ وہ اپنی سماجی زندگی کو اسلامی تعلیمات اور سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہم آہنگ کرنے کا عہد کر رہے تھے۔ پاکستان اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہمارے اسی عہد کا انعام ہی تو ہے۔ حصولِ پاکستان کی جدّ و جُہد بے مثال ہے۔ اگر پاکستان قائم نہ بھی ہوتا، تو متحدہ برّصغیر میں مسلمان اپنے سیاسی، اقتصادی اور سماجی حقوق کچھ نہ کچھ تو ضرور حاصل کر لیتے لیکن اسلامی نظم کے قیام کے تجربے کا کوئی امکان نمایاں نہ ہوتا۔ ہمارا اصل مقصد یہ تھا کہ قیامِ پاکستان کے وسیلے

سے اپنے لئے باعزت اور بامقصد زندگی گزارنے کی راہیں ہموار کریں۔ اقتصادی، فنی اور دیگر ذیلی ترقیاں اس اعلیٰ مقصد کی راہ میں خود بخود منزل بہ منزل حاصل ہوتی چلی جائیں گی۔

پاکستان کے مشن کے بارے میں کوئی شک نہ ہونا چاہیئے، یہ ہے اقامتِ دین اور احیائے اسلام۔ مسلمانوں کے جداگانہ قوم کا تصور تقاضا ہے اسلامی ضابطۂ حیات پر ایمان کا۔ علامہ اقبالؒ کا کمال یہ ہے کہ اس دور میں ہمیں اس حقیقت کا احساس دلایا اور اس وقت ہمیں اپنے اجتماعی تشخص کی یاد دلائی جب اس کی شدید ضرورت تھی۔ اگر حصولِ آزادی کے مرحلے پر ہمارے دلوں میں اس اجتماعی تشخص کی شمع روشن نہ ہوتی تو پورے برِّصغیر کے مسلمان بڑے خسارے میں رہتے۔ بات ملازمتوں میں ناانصافی ونقصان یا اقتصادی خسارے کی نہیں، یہ خسارے تو کسی نہ کسی طرح پورے ہوجاتے ہیں۔ بات اس سے بڑے نقصان کی ہے۔ اگر ہم یہ اعلان نہ کرتے کہ ''ہم ایک الگ قوم ہیں'' تو ہماری فکری وحدت کی جغرافیائی تشکیل پاکستان کی صورت میں ہمیں حاصل نہ ہوتی۔ یہ صدیوں کا نقصان ہوتا، یہ نسلوں کا نقصان ہوتا اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس نقصان کی کوئی تلافی کبھی ممکن نہ ہوتی۔

نظریۂ پاکستان عشقِ اسلام کا دوسرا نام ہے۔ اسی عشق کی بنا پر ایک مردِ مومن کی قیادتِ عظمیٰ میں مسلمانوں نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ انگریزوں اور ہندوؤں کے اکٹھ وسازش اور مغربی دنیا وروس کے غیر ہمدردانہ رویّے کے باوجود تحریکِ پاکستان نے تمام اجتماعی طاقتوں کو شکست دی اور برِّصغیر کا سینہ شگاف کرکے پاکستان کے قیام سے بقولِ علامہ اقبالؒ ثابت کردیا کہ:

عشق اِک سیلاب ہے، سیلاب کو لیتا ہے تھام

علامہ اقبالؒ کا ہم پر یہی ایک نہیں، کئی احسان ہیں۔ انہوں نے نہ صرف

> استاذِ گرامی ڈاکٹر منیر الدین چغتائیؒ اپنے لیکچر اور فکری محافل میں فرماتے کہ آج بھی ہم واہگہ کی سرحد پر کھڑے ہوکر دیکھ لیں کہ کیا کوئی پہاڑ پاکستان اور بھارت کو الگ کررہا ہے؟ کیا ان کے درمیان کوئی دریا حائل ہے جو دونوں ملکوں کے لیے میلوں لمبی سرحد بن گیا ہو؟ کیا انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنے والی کوئی دوسری جغرافیائی رکاوٹ موجود ہے؟ اس کے برعکس وہاں کھڑے ہوں تو یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ پاک سرزمین کس جگہ ختم ہوتی اور بھارت کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان اصل سرحد دین اور لادینی کی ہے۔

ہمارے لئے منزل متعین کی بلکہ قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کو مسلمانانِ برِّصغیر کی قیادت کا جھنڈا لے کر منزلِ پاکستان پر پہنچانے پر آمادہ بھی کیا۔

مسلمانوں پر علامہ اقبالؒ کا ایک اور احسان یہ ہے کہ انہوں نے جدید علمی تقاضوں کے تحت اور نئی اصطلاحات سامنے رکھ کر اسلامی فکر کی پُرتاثیر تشریح کی۔ اسلام خاتمِ مذاہب اور پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفیٰؐ خاتم الانبیاء ہیں۔ اس تصوّرِ ختمِ نبوّت کے بارے میں علامہ اقبالؒ نے کہا:

> پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی دنیائے قدیم وجدید میں ایک واسطے کی حیثیت رکھتی ہے۔ سرچشمۂ وحی کے اعتبار سے حضورِ پاک صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا تعلق دنیائے قدیم سے ہے لیکن اس مکمل ہدایت کی رُوح کا رشتہ دنیائے جدید سے ہے۔ حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس میں زندگی کو علم کے ان تمام سرچشموں تک رسائی ہوگئی جو مرحلۂ شعور تک پہنچ کر اس کے لئے ضروری ہوگئے تھے۔ اسلام میں نبوّت اپنے معراجِ کمال تک پہنچ گئی لہٰذا اس کا خاتمہ ضروری ہوگیا۔ اسلام نے یہ حقیقت واضح کردی کہ انسان ہمیشہ سہاروں پر زندگی بسر نہیں کرسکتا۔ اپنے شعورِ ذات کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ انسان خود اپنے وسائل پر بھروسہ کرنا سیکھے۔ یہ تصوّرِ ختمِ نبوت ہی کے پہلو ہیں کہ اسلام نے مذہبی پیشوائیت کو تسلیم نہیں کیا، موروثی بادشاہت کو جائز قرار نہیں دیا،

بار بار عقل اور تجربے پر زور دیا اور عالمِ فطرت اور عالمِ تاریخ کو انسانی علم کا سرچشمہ ٹھہرایا...

عقیدۂ ختمِ نبوت کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اب نہ تو کسی شخص کو نبوّت کا دعویٰ کرنے کا حق پہنچتا ہے، نہ ہم اسے یہ حق دے سکتے ہیں۔ مافوق الفطرت سرچشمے سے اس کے علم کے تعلق کی بنا پر ہمارے لئے اس کی بلا چون و چرا اطاعت لازمی ہے۔ عقیدۂ توحید اور عقیدۂ ختمِ نبوت کی جو فکری اور علمی تشریح اقبالؒ نے کی ہے اور اس سے معاشرتی فکر و عمل کی جو راہیں روشن ہوئی ہیں، وہ برِّصغیر کے مسلمانوں کے لئے ہی نہیں، پورے عالمِ اسلام کے لئے بہت اہم ہیں۔ اقبالؒ نے اسے روائتی عقائد کے بجائے زندگی کا ایک ہمہ گیر رویّہ قرار دیا ہے۔ اس کا اظہار صرف زبان سے ہی نہیں ہوتا بلکہ عمل سے اس کی تصدیق ہوتی ہے اور دل و نگاہ کے مسلمان بنے بغیر اسلام کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

خِرَد نے کہہ بھی دیا لَآ اِلٰہَ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اور یہ کہ:

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نُور دل کا نُور نہیں

اقبالؒ نے ہمیں مغرب سے اُٹھنے والے فکری اور نظری طوفان سے بہت پہلے آگاہ کیا۔ اقبالؒ مغرب کی علمی، فنّی اور تکنیکی پیش قدمی کے مداح تھے لیکن قرآنِ پاک اور سیرتُ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے انہیں جو بصیرت حاصل ہوئی تھی، اس کی بنا پر وہ مغرب کے فلسفۂ حیات کے تباہ کُن نتائج سے آگاہ ہو گئے تھے، فرمایا:

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں ایسا اُلجھا
آج تک فیصلۂ نفع و ضَرَر کر نہ سکا
جِس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ (Renaiassance۔ بیداری یا نئی زندگی) میں اقبالؒ کے فکر و فن کی اہمیت اس کی ہمہ گیری میں ہے اور یہ ہمہ گیری اس بنا پر ہے کہ انہوں نے اسلام کے ضابطۂ حیات کو اپنا مشن اور نصب العین بنایا اور دورِ حاضر میں مغرب کی علمی و عملی برتری اور ان کے باطل نظریات کی ظاہری توانائی کے مقابلے میں اسلام کی برتری و حقانیت واضح کرنے کا شرف حاصل کیا۔ پھر یہ کہ اسلام کے چھوٹے سے لے کر بڑے افکار و مسائل کی جو فکری اور علمی تشریح اقبالؒ نے کی ہے اور اس طرح معاشرتی فکر و عمل کی جو راہیں روشن ہوئی ہیں، وہ صرف برِّصغیر کے مسلمانوں کے لئے ہی نہیں، پورے عالمِ اسلام کے لئے بہت اہم ہیں۔

موجودہ عالمی حالات میں اقامتِ دین اور احیائے اسلام بے شک بہت کٹھن مشن ہے۔ جہاں تک ہم نے ادائیگیٔ فرض میں کوتاہی برتی ہے ہمیں سقوطِ ڈھاکہ کی شکل میں اس کی سزا بھی مل چکی ہے، لیکن جس مکتبِ فکر نے اس خیال کا پرچار شروع کر رکھا ہے کہ پاکستان کو سیکولرازم اور سوشلزم اختیار کرنا چاہیئے، وہ اس ملک کا دشمن ہے کیونکہ اسلام کو چھوڑ کر پاکستان کا جواز باقی نہ رہے گا اور ہمارے دشمن ہم پر جھپٹیں گے کہ ہم الگ ملک پر کیوں اصرار کر رہے ہیں۔ اس لیے جب یہ کہا جاتا ہے کہ ''قیامِ بنگلہ دیش کے بعد دو قومی نظریہ ختم ہو گیا'' تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اب باقی ماندہ پاکستان کے بچنے کا بھی کوئی جواز نہیں رہا۔ سوچنے اور سمجھنے کا مقام ہے کہ پاکستان ایک نظریے کے نتیجے میں قائم ہوا۔ اگر وہ

نظریہ زائل ہو جائے تو اس کا نتیجہ – پاکستان – کیسے قائم رہ سکتا ہے! اس لئے قیامِ پاکستان کی بنیاد کی حفاظت ہمارا دینی اور ملّی فریضہ ہے۔

قیامِ پاکستان کوئی ماقبل التاریخ کا واقعہ نہیں ہے کہ جس کے مقصد و جواز کی تلاش کے لئے کسی بہت لمبی چوڑی تحقیق کی ضرورت پڑے۔ نہ یہ کوئی متنازع بات ہے کہ 1946ء کے انتخابات – جو ''ایک فرد ایک ووٹ'' کے حق کی بنیاد پر منعقد ہوئے تھے – کے نتیجے میں پاکستان معرضِ وجود میں آیا تھا۔ تحریکِ پاکستان کی ساری جدّ وجُہد قائدِ اعظمؒ کے اُس فرمان کی روشنی میں ہوئی تھی کہ مسلمان بھارت میں بسنے والی کوئی اقلیت نہیں بلکہ ایک جدا قوم ہیں جس کا خدا، دین، ایمان، اندازِ معاشرت، نظامِ عبادات اور رہن سہن کا تصور ہندوستان میں بسنے والی دیگر اقوام سے قطعی جدا ہے اور ہم پہلے مسلمان ہیں اور پھر کچھ اور۔ یہی وجہ ہے کہ برّصغیر کے تمام مسلمانوں نے، چاہے وہ ان علاقوں میں رہتے تھے جو پاکستان کا حصہ بننے والے تھے، چاہے اُن علاقوں میں جنہیں پاکستان کا حصہ نہیں بننا تھا، تمام مفادات کو پسِ پشت ڈال کر، اپنے اپنے مکاتبِ فکر اور فقہی مسالک سے الگ ہو کر اور پاکستان مخالف سکّہ بند دینی اور سیاسی رہنماؤں کی سازشوں اور رکاوٹوں سے بے نیاز ہو کر اپنا ووٹ پاکستان کے حق میں دیا تھا۔ اس کے نتیجے میں 68 برس پہلے دنیا کی وہ ریاست معرضِ وجود میں آئی جو انسانی تاریخ میں مسلمانوں نے اپنے دینی تشخص اور عقیدے کی بنیاد پر اپنی آزادانہ مرضی سے بنائی تھی۔ اس ریاست کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے۔ تحریک و تاریخِ پاکستان اور دو قومی نظریے کا یہ مختصر ترین پسِ منظر ہے۔

اُن گمراہ لوگوں کا نوٹس لینا ضروری ہے جو پاکستان کا کھا کر، پاکستان میں رہ کر غیر مُلکی اشارے پر کہہ رہے ہیں کہ نظریۂ پاکستان پُرانا ہو چکا

> 15 برس پہلے امریکہ سے ایک بلالی بھائی، مظفرالدین، پاکستان آئے۔ پہلی ہی ملاقات میں کہنے لگے کہ برّصغیر کے مسلمانوں کی جدّ وجُہد آزادی ہمارے لئے ایک مثال کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ 23 فیصد تھے جبکہ اُن کے مقابل غیر مسلم 77 فیصد، لیکن انہوں نے حاوی اکثریت سے اپنا حقِ حاکمیت منوایا۔ باقی سارے مسلم ممالک بُنیادی طور پر مسلم اکثریت والے ممالک ہیں۔ پاکستان بنانے والے مسلمانوں جیسی اُن کی کوئی جدّ وجُہد ہمارے سامنے نہیں۔ ان شاءاللہ تعالیٰ دُنیا کے کسی خطے میں جب بھی مسلمان اقلیت سے اکثریت میں بدلے تو پاکستان کی مثال کے حوالے سے یہ مطالبہ کر سکیں گے کہ اُنہیں اپنا پاکستان تعمیر کرنے دیا جائے۔
>
> (21 اپریل 1982- سینٹ ہال، پنجاب یونیورسٹی میں پروفیسر محمد منور کا خطاب)

اس لئے ہمیں اپنی سوچ پر نظرِ ثانی کرنی چاہیے۔ ساتھ ہی نسخہ تجویز فرماتے ہیں کہ پاکستان کی بنیادیں اب سیکولرازم پر استوار ہونی چاہئیں۔ حیرت کا مقام تو یہ ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کو لبرل پاکستان دیکھنے کا کیڑا ابھی بعض دماغوں آن سمایا ہے! یہ محض زبان سے پھسلے ہوئے الفاظ نہیں، یہ سوچی سمجھی کاوش ہے – مغرب کی نظروں میں پسندیدہ رہنے کی کاوش – لیکن یہ شاخِ نازک پہ آشیانہ بنانے والی بات ہے اور کون نہیں جانتا کہ جو شاخِ نازک پر آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا!

جہاں تک دو قومی نظریے کے پرانا ہو جانے کا تعلق ہے تو اگر عقیدے اور نظریے لباس کی طرح صبح و شام بدلنے کی چیزیں ہیں یا موسم کی تبدیلیوں کے ساتھ ان کے تغیرات ضروری قرار پاتے ہیں تو دنیا میں ہر چہرہ اور ہر قوم بے شناخت ہو جائے گی۔ پھر فرد سے لے کر جماعت تک اور معاشرے سے لے کر ریاست تک کوئی چیز بھی اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکے گی۔ یہ تو بڑی سیدھی اور سادہ بات ہے کہ اگر دو قومی نظریہ پرانا ہو کر نظرِ ثانی کا محتاج ہے تو پھر وہ تمام عقائد اور ارکان جو ہماری دینی شناخت،

ملّی پہچان اور ہمارے لئے نشانِ امتیاز ہیں' وجہِ نجات ہیں' جن کے پرانا ہونے کی مدت صدیوں طویل ہے' ان پر عمل درآمد اور ان کو اپنے دل کا ٹکڑا بنانے کا جواز ہم کہاں سے لائیں گے؟

ساری دُنیا کا مرّ وجہ اخلاقی قانون اور بقائے قومیت کا ضابطہ ہمیشہ سے دوقومی نظریہ ہی رہا ہے۔ جرمن صدیوں سے جرمن ہیں۔ دوسری اقوام سے ملنے اور معاہدے وغیرہ کرنے کے بعد بھی وہ جرمن ہی رہتے ہیں۔ برطانیہ والے کسی معاہدے پر متفق ہو جانے سے امریکی نہیں ہو جاتے تو آخر اس بات کی ضرورت ہمیں ہی کیوں پیش آئے کہ ہم اپنی بنیاد کو۔ جو اس نظریاتی مملکت کے وجود کا جواز اور ہمارے ملک کی حقیقی سرحد ہے' جس نے اس خطے کی زمین پر ایک نیا حصارِ عافیت تعمیر کر کے برّصغیر کے مسلمانوں کو تحفظ عطا کیا' ان کا دین' ان کی تہذیب' ان کا تمدن اور ان کا نظامِ زندگی زمانے کی دست بُرد خصوصاً ازلی دشمن سے محفوظ کر دیا۔ یہ کہہ کر کمزور کرنے کی اجازت دیں کہ وہ پرانی ہوگئی ہے!

سپریم کورٹ آف پاکستان اس بارے میں آخری فیصلہ دے چکی۔ عبدالولی خان کے مقدمے (پی ایل ڈی 1976 سپریم کورٹ' صفحہ 167) میں سپریم کورٹ نے قائدِ اعظمؒ کی پاکستان بننے سے پہلے اور بعد کی متعدد تقریروں کا حوالہ دیا ہے جن میں دوقومی نظریے کو تخلیقِ پاکستان کا بنیادی سبب اور اصل جواز قرار دیا گیا ہے اور یہ کہ ... ''ہمارے نزدیک پاکستان کی بقا کی لازمی شرط یہی دوقومی نظریہ ہے۔''

بے نظیر بھٹو کے مقدمے بنام وفاقِ پاکستان (پی ایل ڈی 1988 سپریم کورٹ' صفحہ 416) میں معزز عدالت نے فیصلہ دیا ہے ''... لہٰذا اس بارے میں کوئی شک نہیں ہونا چاہئے کہ نظریۂ پاکستان مسلم قومیت پر مبنی اور اسلامی نظریۂ حیات پر مشتمل ہے۔ اس کا مطلب دستور میں واضح الفاظ میں قرآن وسنت کے احکام بتایا گیا ہے اور یہی مسلم قومیت کے تصور میں اصل عنصر تھا۔ پاکستان کا یہی تصور تھا جو برّصغیر کی تقسیم پر منتج ہوا اور جو دوقومی نظریہ کے نام سے معروف ہے۔ اسلامی نظریۂ زندگی کا تصور نظریۂ پاکستان کے ساتھ قطعی پیوست ہے۔ اسے اس سے الگ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ دوقومی نظریے کی بنیاد ہے' اس لئے پاکستان کی سالمیت میں صرف نظریۂ پاکستان ہی نہیں بلکہ اسلامی نظریہ (اسلامک آئیڈیالوجی) بھی شامل ہے...''

الحمدللہ! پاکستانیوں کی بھاری' بہت بھاری اکثریت نے نظریاتی بے یقینی پھیلانے کی اس جیسی تمام کاوشوں کو کبھی کامیاب نہیں ہونے دیا۔ اب اور آئندہ بھی اس تخریب کاری میں مصروف قوتوں کو اللہ تعالیٰ کی مدد سے شکستِ فاش دے کر آزاد و خود مختار' جدید اسلامی' جمہوری' فلاحی مملکتِ پاکستان اور اس کی بنیاد و تشخص کی بہرصورت حفاظت کریں گے۔ اس لیے پاکستان کے مشن کی تکمیل کا ایک پہلو یہ ہے کہ مثبت طور پر ہماری تمام جدّ وجُہد نظامِ اسلام کے قیام پر مرکوز ہونی چاہئے' اس کے قیام سے نہ صرف ہمارا معاشرہ درست رہے گا اور ہم میں خارجی قوتوں کی مزاحمت کی قوّت پیدا ہوگی' بلکہ ہم اپنے بنیادی حقوق کو ہر آمر کی دست بُرد سے محفوظ و مامون رکھ سکیں گے۔

مختلف چولے پہن کر' نیا راگ چھیڑنے والے اب ''لکیر'' کے اِدھر اور اُدھر ''ایک جیسی ثقافت'' کی تکرار میں مشغول و مصروف ہیں' حالانکہ آج بھی ہم واہگہ کی سرحد پر کھڑے ہو کر دیکھ لیں کہ کیا کوئی پہاڑ پاکستان اور بھارت کو الگ کر رہا ہے؟ کیا ان کے درمیان کوئی دریا حائل ہے جو دونوں ملکوں کے لیے میلوں لمبی سرحد بن گیا ہو؟ کیا انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنے والی کوئی دوسری جغرافیائی رکاوٹ موجود ہے؟ اس کے برعکس وہاں کھڑے ہوں تو یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ پاک سرزمیں کسی جگہ ختم

ہوتی اور بھارت کہاں سے شروع ہوتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان اصل سرحد دین اور لادینی کی ہے۔ جو لوگ پاکستان میں سیکولرازم یا لبرل ازم وغیرہ دیکھنا چاہتے ہیں' وہ (خاکم بدہن) اس سرحد کو مٹانا اور پاکستان کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔اہلِ وطن اس ملک دشمن گروہ اور ان کے دھندے کا قلع قمع کرنے میں غفلت نہ برتیں۔

اگر داخلی محاذ استوار ہو جائے تو ہمیں خارجی عوامل کی زیادہ فکر نہ کرنی چاہئے' کیونکہ مادیّت پرست طاقتوں کے گٹھ جوڑ سے اُن کی خود اعتمادی کا مظاہرہ نہیں ہوتا' بلکہ اس پریشانی کا اظہار ہوتا ہے جو انہیں اپنے معاشروں کے اندرونی تضادات سے لاحق ہے۔ یہ معاشرے اندر سے کھوکھلے ہو چکے ہیں۔مغرب کی قوم پرستی نے تنگ خیالی پیدا کی ہے' وہ دنیا کی روز افزوں وحدتِ جسمانی سے برسرِ پیکار ہے۔ روس نے جو انسانیت کُش نظام مقبوضہ اقوام اور اپنے لوگوں پر مسلط کیا وہ 70 سال سے زائد عرصہ قائم نہیں رہ سکا کیونکہ انسانی فطرت اتنے ظلم کو برداشت نہیں کر سکتی اور اللہ تعالیٰ نے اس ظلم کی رسی دراز نہیں ہونے دی۔اس کے خلاف اقوامِ عالم اپنے بچاؤ کے لیے اُس متحدہ انسانیت کی ہیئتِ اجتماعیہ اختیار کرنا چاہتی ہیں جو نفسِ واحدہ کی تعبیر ہو' اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے جو فلسفۂ زندگی درکار ہے' وہ صرف اور صرف اسلام کی تعلیمات اور اس پر عمل درآمد میں مضمر ہے۔نوعِ انسان' اسی لئے تو اسلام کی طرف آنے پر مجبور ہے۔ہمیں اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کرنا ہے۔اسی کردار کو ادا کرنے کے لیے علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا:

سبق پھر پڑھ صداقت کا' عدالت کا' شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

مقصد کی تکمیل کے لیے داخلی ریاضت کی ضرورت ہے۔اس کے لئے

مَیں 1983ء میں پاک فوج کے ایک سو پچاس رُکنی قافلۂ حج میں شامل تھا جسے خشکی کے راستے ایران' تُرکی' شام اور اُردن سے گزر کر حرمین کریمین میں حاضری کا اعزاز نصیب ہُوا۔ دورانِ سفر ایران کے مختلف شہروں میں چھ دِن قیام رہا۔ان دنوں ایران عراق جنگ کی طرح ایران کا اسلامی انقلاب بھی پورے زوروں پر تھا۔ جی چاہتا تھا کہ آیت اللہ روح اللہ امام خمینی کی زیارت ہو جائے۔اور کیا ہی اچھا ہو کہ اُن سے بات بھی ہو جائے۔اتاشی محترم کی کاوش سے چار دیگر افسران کے ہمراہ قُم شریف میں امام خمینیؒ کی زیارت کا شرف حاصل ہُوا۔ میں اُن دنوں پاکستان کی برّی' بحری اور فضائی افواج کے ترجمان ویکلی ھلال کا ایڈیٹر تھا' اس لئے طے پایا کہ ضرورت پڑی تو صرف مجھے ہی بات چیت کرنا ہوگی۔امام خمینیؒ کی عام فہم فارسی گفتگو ایرانی ترجمان ٹھیک ٹھیک اُردو میں ہم تک پہنچا رہے تھے۔عرض کیا: عالَمِ اسلام کو درپیش مسائل کا حل کیا ہے؟ چند لمحے خاموشی کے بعد امام خمینیؒ نے فرمایا: مجھے تو بتایا گیا ہے آپ لوگوں کا تعلق مملکتِ اسلامی جمہوری پاکستان سے ہے۔عرض کیا: الحمدللہ ہم پاکستانی ہیں۔امام خمینیؒ کہنے لگے: کیا اقبال لاہُوری کا نام سنا ہوا ہے؟ عرض کیا کہ لاہُور میں ایک عرصہ تک زیرِ تعلیم رہا۔لاہُور میں موجود اقبال شناسوں کی قدم بوسی کا اعزاز حاصل ہے۔علامہ کا کچھ کلام یاد ہے اور میرے والد ملک مہر خان کو اُردو اور فارسی میں کلامِ اقبالؒ کا بڑا حصہ ازبر ہے۔ امام خمینیؒ نے متبسّم ہو کر فرمایا: ''مسلمانوں کے مسائل کا حل مجھ سے پوچھنے کے بجائے اقبال لاہُوری کے کلام کا سمجھ کر مطالعہ کریں۔صرف عالَمِ اسلام ہی نہیں' عالَمِ انسانیت کے مسائل کا حل مل جائے گا اس میں' اور یہ سلسلہ تا قیامت فراواں رہے گا کیونکہ اقبال لاہُوری کا کلام قرآن مجید اور سُنتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عکس ہی تو ہے۔''

ایسی فکر و عمل ناگزیر ہے جو ایمان کی فراست کی روشنی سے مستقبل کے خاکے کو دیکھ سکے اور قوم کو ایسے رستے پر لگائے کہ جب فاسد و باطل افکار اور عقائد کے بادل چھٹ جائیں' تو ہمیں اپنی منزل صاف نظر آئے۔

نعمان وحید (ایم سی ایس)

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے

سوال کیا گیا' زندگی کس طرح گزاری جائے؟ کس طرح رہا جائے؟ فرمایا''اُس زمین کی طرح رہو جس پر نیک و بد ایک طرح سے چلتے ہیں''۔ پڑھنے میں ایک سطر مگر مفہوم میں پوری کتاب یہ اس عارف کا قول ہے جس کے سایہ عاطفت میں حضرت سری سقطیؒ ' شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور علی بن عثمان الجوریؒ جیسے متصوف پیدا ہوئے۔ سیدنا جنید بغدادیؒ کا یہ قول اپنے اندر صبر' برداشت' احترام' محبت اور ہمت و عزم کا درس لیے ہوئے ہے۔

آج تمام طبقات میں جو چپقلش ہے' ہر سطح پر جو نامرادی اور بے سکونی کی کیفیت ہے' نام نہاد آگے بڑھنے کی دھن ہے جس میں ہم اپنوں کا ہی حق مار کے ترقی کی بے چین اور بے یقین راہ اپناتے ہیں۔ اس تمام اضطراب کا حل سیدنا جنید بغدادیؒ کا ذکر کردہ قول کیونکر نہیں ہو سکتا؟ دوسرے کے لیے نرم گوشہ رکھنا ہی انسانیت ہے: بقول خواجہ میر درد:

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

آج علوم اسلامیہ پر تحقیق در تحقیق ہو رہی ہے' ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کی جا رہی ہیں لیکن امت مسلمہ کے حالات جوں کے توں ہیں۔ کیا ہم ایک طرف کے ہو کر نہیں رہ گئے؟ سوچنے کی بات ہے۔ ہمیں خلیفہ دوم حضرت عمر بن خطابؓ کے اس قول پر سوچنا چاہیے کہ ''ہم دھوکہ نہیں دیتے مگر دھوکے کی ہر قسم جانتے ہیں''، ہمیں علی بن عثمان الجوریؒ کے اس قول کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے کہ ''تمام علوم سے اتنا علم ضرور حاصل کرو جو تمہیں خدا کی شناخت تک لے جائے''۔

آج اس ارض پاک میں جو بے مہری ایام ہے کیا اس کے ذمہ دار ہم خود نہیں؟ خوں ریزی' قتل و غارت گری' نا انصافی' بے مروتی اور فسق و فجور عام ہے۔ کیا یہ تمام خرابیاں ہمارے اپنے ہاتھوں سے ہی پیدا کردہ نہیں ہیں؟ وطن عزیز کو جلتا دیکھ کر کوئی آہ و پکار نہ ہو تو کیونکر نہ ہو؟

تجھ کو کتنوں کا لہو چاہیے اے ارضِ وطن
جو تری ارضِ بے رنگ کو گلزار کرے

کتنی آہوں سے کلیجہ تیرا ٹھنڈا ہوگا
کتنے آنسو تیرے صحراؤں کو گلزار کریں

لیکن حل بھی تو واضح ہے۔ وہی جو تحریر کے آغاز میں پیش کیا گیا ہے۔ صبر اور برداشت کو تقویت دینا ہوگی۔ دوسرے کی عزتِ نفس کا احترام کرنا ہو گا۔ آگے بڑھنے کی جدوجہد میں دوسروں کے حقوق کا خیال رکھنا ہوگا۔ بصورتِ دیگر یوں ہی لاشیں گرتی رہیں گی' یوں ہی خون بہتا رہے گا اور ہم تماش بین بنے رہیں گے۔ لیکن ہمیں ان کٹھن حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنا ہوگا۔ ہمت و عزم سے کام لینا پڑے گا۔

وہ مرد نہیں جو ڈر جائے حالات کے خونیں منظر سے
جس دور میں جینا مشکل ہو اس دور میں جینا لازم ہے

ہمیں اپنے علمی معیار کو بھی بلند کرنا پڑے گا کیونکہ عرفانِ الٰہی اس کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ عقل، فہم اور وجدان کے مدارج طے کرنا پڑیں گے۔ وگرنہ ہم وہ تمام دنیائیں مسخر نہیں کر سکتے جن کے کرنے کا حکم ہے۔

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

مگر المیہ یہ ہے کہ ہم راستے کی رنگینیوں میں ہی محو ہو جاتے ہیں اور پھر وہیں رہ جاتے ہیں۔ جستجو اور جدوجہد سب ماند پڑ جاتی ہے۔

چمن کے رنگ و بو نے اس قدر دھوکے دیے مجھ کو
کہ میں نے ذوقِ گل بوسی میں کانٹوں پر زباں رکھ دی

ہمیں اگر آگے بڑھنا ہے تو پھر دلوں کو بھی بڑا کرنا ہوگا۔ کدورتوں اور نفرتوں کو پیچھے چھوڑنا ہوگا۔ لفظوں کو پھول کی پتیوں کی مانند جوڑنے کے بارے میں مہر واصف علی واصف نے کیا خوب کہا

بڑی منزلوں کے مسافر چھوٹا دل نہیں رکھتے

یہ لکھتے ہوئے احمد فراز یاد آئے۔

لفظ کو پھول بنانا تو کرشمہ ہے فراز
ہو نہ ہو کوئی تو ہے میری نگارش میں شریک

لیکن یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ ان تمام کوششوں، محنتوں اور جستجوؤں کا حاصل صرف ایک ہی ہے جس کے بارے میں عصرِ حاضر کے عارف کا کہنا ہے۔

Allah is the top priority of intellectual curiosity

آخر سچ بھی یہی ہے اور ہمیں ماننا پڑے گا۔

مجھے منزلوں کی طلب نہیں، کبھی ہوتی ہوگی یہ اب نہیں
جو ترے خیال میں کھو گئی، اسی چشمِ تر کی تلاش ہے

☆☆☆☆☆☆

ذات الاکمال عباسی (ایم سی ایس)

مَیں کشمیر ہُوں

میرا نام کشمیر ہے میں برصغیر پاک و ہند کے شمال مغرب میں واقع ہوں۔ میرا کل رقبہ 69547 مربع میل ہے۔ میرے آباؤ اجداد کی طرح میری تاریخ بھی بڑی پرانی ہے۔ ہندو راجاؤں نے مجھ پر تقریباً چار ہزار سال تک حکومت کی ہے۔ میں اپنی تاریخ نہیں دُہراؤں گا بلکہ میں آپ کو وہ کہانی سنانے جا رہا ہوں جو تقسیمِ ہند سے شروع ہوتی ہے۔

انگریز جب برصغیر سے جانے لگے تو انہوں نے برصغیر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک کا نام پاکستان رکھا گیا اور دوسرے کا نام بھارت۔ تقسیم کے مطابق ریاستوں کو خود مختاری دی گئی تھی کہ وہ جس ملک کے ساتھ چاہیں مل سکتی ہیں اور اگر علیحدہ رہنا چاہیں تو خود مختار بھی رہ سکتی ہیں چونکہ میں برصغیر کی سب سے بڑی ''رانی ریاست'' تھی

اس لیے سب کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ پاکستان کے لیے کشمیر شہ رگ کی حیثیت رکھتا تھا اور بھارت اس پر قبضہ کرنے پر تلا ہوا تھا۔

26 اکتوبر 1947ء کو ہندو مہاراجا ہری سنگھ نے مسلمانوں کی مرضی کے خلاف کشمیر کا الحاق بھارت کے ساتھ کر دیا اور یوں بھارت نے میرے سینے پر اپنی فوجیں اتار دیں۔ انہی حالات میں میرے شیروں نے دشمنوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا اور لوگوں کو متحد کر کے مجھے دشمنوں سے آزاد کروایا۔

مسلمانوں نے مل کر بہت سا علاقہ ہندوؤں سے آزاد کروالیا۔ اسی دوران ان کو ہتھیاروں کی کمی کا سامنا کرنا پڑا جس کے لیے انہوں نے قبائلی علاقوں کا رخ کیا تاکہ ہتھیار خرید کر آزادی کی جنگ کو منطقی انجام تک پہنچا سکیں' جب ان لوگوں کے ذریعے قبائلی علاقوں میں خبر پہنچی تو وہ بھی مدد کے لیے آ پہنچے۔ قبائلی علاقوں سے آئے ہوئے لوگوں نے مظفر آباد کے راستے سری نگر کا رخ کیا اور کافی علاقہ فتح کر لیا۔ دوسری طرف مقامی لوگوں نے باغ' پونچھ' راولا کوٹ' پلندری اور میر پور کے بہت سے علاقے فتح کر لیے۔ اس دوران بھارت نے سری نگر میں فوجیں اتار دیں۔

اس کے بعد جنگ بندی کا اعلان ہو گیا۔ جو حصہ آزاد ہو چکا تھا' وہ آزاد کشمیر کہلایا اور جو ہندوؤں کے قبضے میں ہے' وہ مقبوضہ کشمیر کہلایا۔ تاہم کشمیر کی آزادی تک جنگ جاری رہے گی کیونکہ:

یارانِ جہاں کہتے ہیں کشمیر ہے جنت
جنت کسی کافر کو ملی ہے' نہ ملے گی

☆☆☆☆☆

میں خیانت کیسے کروں؟

(عظیم قائد کے حوالے سے ایک سبق آموز واقعہ)

ایک دفعہ قائدِ اعظمؒ کسی کیس کے سلسلے میں آگرہ تشریف لے گئے۔ مسلم لیگ کے کارکنوں کو خبر ہوئی تو وہ ان کی خدمت میں پہنچے۔

کارکن: جناب والا! یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ آگرہ میں تشریف لائے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آگرہ مسلم لیگ کی طرف سے ایک بڑا جلسہ کریں اور آپ اس میں تقریر فرمائیں۔

قائدِ اعظمؒ: میں آپ کے جذبے کی قدر کرتا ہوں۔ اس جلسے سے مسلم لیگ کے مشن کو تقویت پہنچے گی اور اس کی اہمیت اور ضرورت کا بھی مجھے احساس ہے مگر اس کے باوجود بھی میں اس جلسہ میں تقریر نہیں کر سکوں گا۔

کارکن: (تعجب سے) کیوں؟ کیا ہم سے کوئی کوتاہی ہوئی؟

قائدِ اعظمؒ: نہیں ایسی بات نہیں۔

کارکن: تو پھر کیا وجہ ہے؟ ارشاد فرمایا۔

قائدِ اعظمؒ: وجہ ایک معمولی سی بات ہے۔

کارکن: جی!

قائدِ اعظمؒ: دیکھیے! میں یہاں اپنے مؤکل کی طرف سے پیش ہونے آیا ہوں' جس کی وہ فیس ادا کر رہا ہے۔ میں خیانت کیسے کروں؟ آپ جلسہ کرنا چاہتے ہیں تو ضرور کریں۔ چند دنوں کے بعد بُلا لیں۔ میں اپنے خرچ پر آؤں گا۔

محمد سالار ارشد (ایم سی ایس)

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی

یہ اٹھارہویں صدی کی بات ہے کہ اُس وقت کے امریکی صدر نے سیاہ فاموں کے عظیم رہنما مارٹن لوتھر کنگ کو طلب کر کے کہا کہ اگر تم اِن لوگوں کی حمایت کرنا چھوڑ دو تو ہم تمہیں ڈالروں میں تول دیں گے' اگر تم اِن اَن پڑھ گنوار لوگوں کی حمایت کرنا چھوڑ دو تو ہم تمہاری زندگی سنوار دیں گے۔ یہ دروازے کے قریب جو آہٹ سنائی دے رہی ہے' یہ تمہاری کامیابی کی پکار ہے' تم کن لوگوں کی بات کرتے ہو؟ اُن کی جو اَن پڑھ' گنوار اور جاہل ہیں؟ مارٹن لوتھر کنگ جونیئر مسکرا کر کہنے لگا کہ کیا تمہیں اُن گنگناتے پرندوں کی صدا سنائی نہیں دیتی جو ہماری فتح کے گیت گاتے ہیں؟ کیا تمہیں میرے مزدور بھائیوں کا خون پسینہ نظر نہیں آتا جو دن رات بہایا جا رہا ہے۔ تم چاہے میرے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالو' اِن ٹکڑوں کو آگ لگا دو' اُس کی خاک پانی میں بہا دو مگر پھر بھی میں تمہاری حمایت نہیں کروں گا کیونکہ جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی۔ اور ہماری زندگی جہدِ مسلسل سے عبارت ہے۔

یہاں عزت اور عظمت اُسی کو ملتی ہے جو محنت اور عمل پسندی کے تمغے اپنے سینے پر سجاتا ہے۔ یہی عظمت مکّے کی گلیوں میں پتھراؤ کا سامنا کرتی ہے۔ اِسی عظمت کو لہولہان ہونا پڑتا ہے کیونکہ انقلاب چند روز کی مشقت کا نام نہیں' انقلاب انسانی زندگی کو بدل دینے کا نام ہے۔ تمام عالم میں جس نے بھی اپنے دن رات ایک کر کے نئے چراغ جلائے' تاریخ اُنہیں کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ چین کا ماؤزے تنگ مدتوں بھٹکتی قوم کو اپنا خون پسینہ اور مشقت دے کر ترقی اور خوشحالی کے دھارے پر لا کھڑا کرتا ہے۔ پاکستان کا بانی محمد علی جناحؒ اپنی زندگی میں کئی زندگیاں آزاد کرتا ہے اور ایک نئی مملکت کو معرضِ وجود میں لاتا ہے کیونکہ بشر بے چین ہو تو انقلاب آ ہی جاتا ہے۔ اگر ہم بھی چاہتے ہیں کہ مورّخ ہمیں ایک اچھے نام سے یاد رکھے اور ہماری قوم کا نام رہتی دنیا تک دلوں میں رہے' تو ہمیں اپنی زندگی میں تبدیلی لانا ہو گی کیونکہ سب سے پہلی تبدیلی انسان خود اپنے اندر سے لاتا ہے اور پھر انقلاب کی جستجو میں گم ہو جاتا ہے۔ ہمیں خود احتسابی سے کام لے کر عمل پسندی کو اپنا شعار بنانا ہو گا تاکہ ہماری قوم کا نام ہمیشہ یاد رکھا جائے اور دوسری قومیں بھی ہمارے کام پر رشک کریں۔ وطنِ عزیز پاکستان برِصغیر کے لاکھوں مسلمانوں کی جدوجہد اور قربانیوں سے 1947ء میں معرضِ وجود میں آیا۔ قوموں کی زندگی میں نشیب و فراز آتے ہی رہتے ہیں اور ہماری قوم کو بھی مشکل حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ اللہ کے فضل و کرم سے پاکستان دنیا کی آٹھویں جوہری قوت ہے اور اس کو مسلم اُمہ میں ایک کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ پاکستانی زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی محنت' لگن اور بلند حوصلگی کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔ ہماری فوج کا شمار دنیا کی بہترین افواج میں ہوتا ہے۔ وہ وقت دور نہیں جب پاکستان دنیا کی ترقی یافتہ اقوام کی صف میں کھڑا ہو گا ان شاءاللہ!

جاوید اختر (ایم سی ایس)

سوشلزم اور کمیونزم کی دوڑ میں پاکستان کا مقام

بیسویں صدی میں ایک طرف سرمایہ دارانہ نظام تھا جس کے پیروکار امریکہ اور اس پر حاوی یہودی تھے اور دوسری طرف کمیونزم تھا جس کی جنگ روس اور چین لڑ رہے تھے دونوں مخالف قوتیں اپنے نظام کو زندہ رکھنے اور دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے ہر طرح کی کوشش کر رہی تھیں۔ روس افغانستان سے سفارتی تعلقات بڑھا رہا تھا۔ تاکہ وہ افغانستان اور پاکستان کے راستے گرم پانی تک پہنچ کر وسطی ایشیائی ریاستوں میں موجود ذخائر کو عالمی منڈی تک پہنچا سکے' اس مقصد کے لئے تاجکستان سے پاکستان تک بجلی کی لائن بچھائی جانی تھی اور اس لائن کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کی سڑک بھی تعمیر کی جانی تھی اور اس سڑک سے تجارت کی مد میں پاکستان کو ملین ڈالرز کا استفادہ ہونا تھا' پاکستان میں گوادر بندرگاہ کی تعمیر کے ساتھ ساتھ اس سے ملحقہ علاقے صنعتی شکل اختیار کر جاتے اور بلوچستان میں موجود معدنی ذخائر کو بروئے کار لاتے ہوئے پاکستان اپنی حالت میں کئی گنا بہتری لا چکا ہوتا یہ وہ ساری کہانی تھی جو اگر ہو جاتی تو شاید ہماری قسمت بدل جاتی۔

تصویر کا دوسرا رخ اب ہمارے سامنے ہے جس کی سزا ہم اب تک بُھگت رہے ہیں روس جب سفارتی طریقے سے افغانستان پر حاوی نہ ہو سکا تو اس نے طاقت کے زور پر حاوی ہونے کی کوشش کی تاکہ وہ افغانستان کے راستے عالمی منڈی پر قبضہ جما سکے۔ یہ وہ بہتر وقت تھا جب سرمایہ دارانہ نظام کے حواری امریکہ اور اس پر قابض یہودی روس کو افغانستان میں پھنسا کر کمیونزم کو شکست دے سکتے تھے لہٰذا یہی ہوا امریکہ نے مسلمانوں کو مذہب اور جہاد کے نام پر اکٹھا کیا اور افغانستان میں روس پر دھاوا بول دیا۔ یوں روس کو شکست فاش ہوئی اور امریکہ تنہا سپر پاور بن گیا۔

روس کو اس جنگ کی قیمت اس طرح ادا کرنا پڑی کہ جن وسط ایشیائی ریاستوں کے وسائل کو عالمی منڈی میں بیچ کر وہ حکومت کرنا چاہتا تھا وہ ان ریاستوں سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اس کے بعد جب دوبارہ افغانستان کے حالات روس کے لیے کچھ بہتر ہونے لگے تو امریکہ نے 9/11 کا بہانہ بنا کر دوبارہ افغانستان پر ہلہ بول دیا تاکہ روس افغانستان میں قدم نہ جما سکے۔ 2014ء میں افغانستان سے انخلاء کے بعد دس ہزار امریکی فوجیوں کا یہاں رہنا اس خوف کا اظہار ہے کہ یہ علاقہ کہیں روسی تسلط میں نہ چلا جائے۔ اس ساری کہانی میں پاکستان کو نقصان یہ ہوا کہ پاکستان عالمی منڈی میں وسط ایشیائی وسائل کی رسائی کے لئے دروازہ نہ بن سکا۔ الٹا بلوچستان کے حالات خراب کر کے گوادر پورٹ کی تعمیر کو بھی نقصان پہنچایا گیا۔ چلو روس سے دوری کی وجہ تو سمجھ آتی ہے کہ ہم شروع سے اس کے قریب ہی نہ جا سکے مگر امریکہ کے دوست ہو کر بھی ہم اس کے ہاتھوں نقصان اٹھاتے رہے اس ساری بات کو میں یوں مختصر کروں گا کہ:

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم
نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

تحقیق و تالیف: پیر اکرم

ولیم شیکسپیئر

ایک نابغہء روزگار، ڈرامہ نگار اور اداکار

پُراسرار آغاز

ولیم شیکسپیئر دنیا کے تمام ممالک میں بطور ایک عظیم ڈرامہ نگار اور اداکار مانا جاتا ہے۔ چار صدیوں سے زیادہ عرصہ کے بعد بھی اس کے تحریر کردہ ڈرامے دنیا کی بے شمار بستیوں، دیہاتوں، شہروں اور راجدھانیوں میں آئے دن پیش کئے جاتے ہیں۔لیکن یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ اس کی ذاتی زندگی پردہء راز میں پوشیدہ ہے۔صرف دو حوالے ایسے ہیں جو مؤرخین کو اس کی زندگی کا اساسی خاکہ مہیا کرتے ہیں۔ایک تو اس کی تصانیف ہیں یعنی ڈرامے، نظمیں وغیرہ، دوسرے وہ مستند دستاویزات جو گرجا گھروں اور عدالتوں کے ریکارڈ پر مشتمل ہیں۔تاہم یہ دستاویزات بھی اس کی زندگی کے واقعات کی بہت سرسری سی تصویر پیش کرتے ہیں، جن میں محض واقعات کا مختصر سا ذکر ہوتا ہے۔بہ نسبت اس کے کہ ان واقعات نے اس شخص کو یا اس کی زندگی کو جس پر یہ وقوع پذیر ہوئے ہیں کیسے اور کتنا متاثر کیا ہے تاہم جتنی بھی معلومات حاصل ہوسکی ہیں ان کا لُبِ لباب یہ ہے۔

پیدائش اور ابتدائی زندگی

اگرچہ ولیم شیکسپیئر کی پیدائش کے متعلق کوئی تحریری دستاویز موجود نہیں ہے تاہم ایک گرجا گھر کے ریکارڈ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی رسمِ اطباغ یعنی نام رکھنے کی رسم سٹریٹ فورڈ اپان ایون میں واقع ہولی ٹرینیٹی چرچ میں 26 اپریل 1564ء کے روز ادا کی گئی چنانچہ اس کے مدنظر یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ وہ 23 اپریل 1564ء کے لگ بھگ پیدا ہوا۔عالم فاضل لوگوں کا اُس کی اِس تاریخ پیدائش پر اتفاق ہے۔

سٹریٹ فورڈ لندن کے مغرب میں 103 میل کے فاصلے پر واقع ہے۔اُن دنوں یہ ایک ایسا قصبہ تھا جہاں ایک خرید و فروخت کی منڈی تھی۔

والدین

ولیم شیکسپیئر کے والد کا نام جان شیکسپیئر تھا وہ چمڑے کا تاجر تھا جو ولیم کی پیدائش سے پہلے نہ صرف ایک کامیاب تاجر بن چکا تھا بلکہ نائب میئر اور میئر کے سرکاری عہدوں پر فائز تھا۔

ولیم کی والدہ کا نام میری آرڈن تھا۔وہ ایک مقامی دولت مند زمیندار تھی۔جائیداد کی مالک تھی جو اسے اپنے باپ سے ورثہ میں ملی تھی۔

خاندان

ولیم اپنے والدین کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ولادتی ترتیب میں وہ تیسرا بچہ تھا۔ دو بہنیں جون اور جوڈتھ اس سے بڑی تھیں۔اُس کے تین بھائی گلبرٹ، رچرڈ اور ایڈمنڈ اس سے چھوٹے تھے۔

بچپن

ولیم شیکسپیئر کے بچپن کے بارے میں بہت کم معلومات مہیا ہیں۔اُس کی

تعلیم کے بارے میں ناکافی اور غیر یقینی معلومات نے لوگوں کو یہ سوال اٹھانے پر مجبور کر دیا ہے کہ کیا کوئی اس نام کا شخص موجود بھی تھا اور کیا یہ تمام ڈرامے اور شاعری شیکسپیئر ہی کی تصنیف کردہ ہیں۔

شادی

کینٹر بری صوبہ کے شہر Worcerter میں 28 نومبر 1582ء کے روز ولیم شیکسپیئر نے Anne Hathauray سے شادی کر لی۔ وہ سٹریٹ فورڈ کے مغرب میں ایک میل کے فاصلے پر واقع ایک چھوٹے سے گاؤں Shattery کی باسی تھی۔ عمر میں وہ ولیم سے آٹھ برس بڑی تھی۔ ولیم 18 سال کا تھا اور وہ 26 برس کی تھی۔ شادی کے وقت وہ پہلے ہی سے حاملہ تھی۔ ولیم شیکسپیئر اُن دنوں مالی مشکلات میں گھرا ہوا تھا۔ مقروض تھا اور قرض ادا کرنے کے قابل نہیں تھا۔ اس نے اسے اپنی خوش قسمتی گردانا کہ ایک مالدار خاتون اسے بیوی کے طور پر مل رہی ہے۔ بیوی کا اس سے عمر میں 8 برس بڑا ہونا اور شادی سے پہلے حاملہ ہونا ولیم کی مالی مشکلات کے مدنظر نظر انداز کر دیا گیا کہ اس شادی سے اسے مالی منفعت کی اور قرضوں سے نجات پانے کی امید ادکھائی دے رہی تھی۔ مختصر یہ کہ شادی قائم رہی اور شیکسپیئر اپنے تھیٹر کی کمائی کا ایک حصہ سٹریٹ فورڈ میں اپنے ادارے کو وسیع کرنے پر خرچ کرتا رہا۔

اولاد

شادی کے ٹھیک چھ ماہ بعد 26 مئی 1583ء کے دن ان کا پہلا بچہ بیٹی Susanna پیدا ہوئی۔ دو سال بعد 2 فروری 1585ء کو جڑواں بچے Hamnet اور Judith پیدا ہوئے۔ جُوڈتھ کا 11 سال کی عمر میں نامعلوم وجہ سے انتقال ہو گیا۔

گم شُدہ سات برس

جڑواں بچوں کی پیدائش کے بعد ولیم شیکسپیئر کی زندگی کے برسوں کے بارے میں کوئی ریکارڈ موجود نہیں۔ عالم فاضل لوگ اس عرصہ کو ''گُم شدہ برسوں'' سے موسوم کرتے ہیں۔

اس بارے میں وسیع قیاس آرائیاں کی جاتی رہی ہیں کہ اس عرصہ میں شیکسپیئر کیا کرتا رہا ہے۔ ایک نظریہ تو یہ ہے کہ ولیم دوسروں کی جائیداد میں بے جا مداخلت کرنے اور بے جا تجاوزات کا مرتکب ہوا تھا جس کی بنا پر وہ مقامی زمینداروں اور جائیداد کے مالکوں کی ناراضگی سے بچنے کی خاطر ان کی نظروں سے اوجھل رہا اور چُھپ گیا۔

ایک دوسرا امکان یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ لنکا شائر میں بطور اسسٹنٹ سکول ماسٹر کام کرتا رہا۔ عام طور پر یہ باور کیا جاتا ہے کہ 1580ء کے وسط یا اواخر میں وہ لندن آ گیا جہاں اسے کسی اچھے تھیٹر میں گھوڑوں کی خاطر پاشی کا کام مل گیا تھا۔ صدیوں کے بعد ہالی ووڈ اور براڈوے میں اعلیٰ مقام حاصل کرنے کے مشتاق اور متمنی اداکاروں اور ڈرامہ نویسوں نے اس منظر نامے کو دہرا کر پھر سے تازہ کر دیا ہے۔

شیکسپیئر کا ذریعہء معاش اور پیشہ ورانہ شغل

اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ 1592ء تک ولیم شیکسپیئر نے گزر بسر کے لئے بطور ڈرامہ نگار اور اداکار ممکنہ طور پر اپنے کئی ڈرامے پیش کیے۔ اپنے پیشے کے آغاز میں وہ Earl of Southampton کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں یوں کامیاب ہو گیا کہ اس نے اپنی پہلی اور دوسری اشاعت شدہ نظموں The Rape of Lucrece (1594) اور Venice and Adonis (1593) کو اول کے نام معنون کر دیا۔

1597ء تک اس کے لکھے ہوئے 37 ڈراموں میں سے 15 ڈرامے

شائع ہو چکے تھے۔ سول دستاویزات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دوران اس نے اپنی فیملی کے لئے سٹریٹ فورڈ میں دوسرا سب سے بڑا مکان خرید لیا تھا جو ''نیا گھر'' (New House) کہلاتا تھا۔

1599ء تک اس نے اور اس کے کاروباری حصہ داروں نے دریائے ٹیمز کے جنوبی کنارے پر اپنا تھیٹر تعمیر کر لیا تھا جس کا نام The Globe رکھا گیا تھا۔ 1605ء میں اُس نے سٹریٹ فورڈ کے قریب 440 پاؤنڈ میں غیر منقولہ جائیدادیں اور اراضی اجارے (پٹے) پر لے لیں۔ کچھ عرصہ بعد ان کی قیمتیں دگنی ہو گئیں اور اِس کی آمدن میں 60 پاؤنڈ فی سال کا اضافہ ہو گیا۔ اس صورتِ حال نے اسے نہ صرف ایک کاروباری منتظم بلکہ ایک فنکار بھی بنا دیا۔ عالم فاضل لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ اس سرمایہ کاری نے اسے اتنی فراغت اور اتنا وقت مہیا کر دیا کہ وہ یکسوئی کے ساتھ ڈرامے لکھتا رہا۔

سٹریٹ فورڈ سے لندن کا فاصلہ بذریعہ گھوڑ سواری چار دن کا تھا چنانچہ یہ اعتبار کیا جاتا ہے کہ وہ اپنا زیادہ تر وقت شہر ہی میں گزارتا تھا۔ وہ سال میں ایک مرتبہ ایسٹر سے پہلے ان دنوں گھر آتا تھا جب تھیٹر 40 دن کے لئے بند ہو جاتے تھے۔

1594ء کے بعد وہ لندن کی ایک تھیٹریکل کمپنی ''لارڈ چیمبرلین کے ارکان'' کا ایک اہم چیمبر بن گیا۔ تحریری شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ 1590ء کے ابتدائی برسوں میں وہ اس کمپنی کا انتظامی حصہ دار بن چکا تھا۔ جیمز اول کی تاجپوشی کے بعد 1603ء میں اس کمپنی نے اپنا نام تبدیل کر کے ''بادشاہ کے ارکان'' King's Men رکھ لیا تھا۔ یہ کمپنی بہت پسندیدہ، ہر دلعزیز اور مقبولِ عام رہی۔ تحریری ریکارڈ سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیکسپیئر نے اپنے ڈرامے طبع کروائے جو بطور ''پسندیدہ ادب'' فروخت ہوئے۔

ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا
اس دشت سے بہتر ہے نہ دلّی، نہ بخارا

جس سمت میں چاہے صفتِ سیلِ رواں چل
وادی یہ ہماری ہے، وہ صحرا بھی ہمارا

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دَو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا

حاصل کسی کامل سے یہ پوشیدہ ہنر کر
کہتے ہیں کہ شیشہ کو بنا سکتے ہیں خارا

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملّت کے مقدر کا ستارہ

محروم رہا دولتِ دریا سے وہ غوّاص
کرتا نہیں جو صحبتِ ساحل سے کنارہ

دِیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملّت
ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا

دُنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو اُبھارا

اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسا
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

تقدیرِ اُمم کیا ہے؟ کوئی کہہ نہیں سکتا
مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارا

اخلاصِ عمل مانگ نیاگانِ کہن سے
شاہاں چہ عجب گر بہ نوازند گدا را

علامہ اقبالؒ

سولہویں صدی میں انگلستان کے اشرافیہ (اعلےٰ طبقے کے لوگوں) میں تھیٹر کلچر بہت محبوب، پسندیدہ اور قابلِ تحسین نہیں تھا۔ تاہم شرفا فنِ اداکاری اور اداکاروں کو بہت دوست رکھتے تھے، ان کی قدر کرتے تھے اور

ان کے سرپرست، معاون اور مددگار ہوتے تھے۔

تحریری دستاویزات اس بات کی بہت کم نشاندہی کرتی ہیں کہ شیکسپیئر کی پیشہ ورانہ زندگی اور اس کی تخلیقی صلاحیتیں کیسے کاریگری اور فنکارانہ معراج میں ڈھل گئیں۔ محض ایک مفروضے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ 20 برسوں پر مشتمل عرصہ میں اس نے متنوع ڈرامے لکھے جنہوں نے انسانی جذبوں کے مختلف تضادات اور اختلافات کے وسیع اتار چڑھاؤ اور کیفیات کو بہت واضح الفاظ میں عکس بند کیا۔

شیکسپیئر کے ادبی ورثے یعنی تصنیفات کے بارے میں تنازعہ

یہ بات کسی ستم سے کم نہیں ہے کہ شیکسپیئر کے انتقال کے ایک سو پچاس (150) برس کے بعد یہ شاخسانہ کھڑا کر دیا گیا ہے کہ ''شیکسپیئر کے ڈرامے کس نے لکھے ہیں؟

ڈیڑھ صدی کے بعد ایسے گروہ ظہور پذیر ہوئے ہیں جو شیکسپیئر کے اپنے ڈراموں کا مصنف ہونے پر اعتراض کرتے ہیں۔ بعض عالم فاضل اور ادبی نقادوں نے تو یہاں تک دعویٰ کیا ہے کہ شیکسپیئر کے ڈراموں کے اصل مصنفین کرسٹوفر مارلو، فرانسس بیکن اور ایڈورڈ ڈی ویئر ہیں۔

اس تنازعے کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ شیکسپیئر کی ذاتی زندگی، خصوصاً اس کی تعلیم کے بارے میں بہت کم مستند اور ناکافی معلومات مہیا ہیں۔ ہولی ٹرینیٹی چرچ اور سٹریٹ فورڈ کے حکومتی ریکارڈ سے ولیم شیکسپیئر کا وجود تو ثابت ہوتا ہے لیکن ان کی کوئی بھی دستاویز اُس کے اداکار اور ڈراما نویس ہونے کی تصدیق نہیں کرتی۔

دوسرا یہ کہ مذکورہ بالا ان تینوں اشخاص کی زندگی کے پسِ منظر اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں اور ادبی خوبیوں کے لوگ معترف ہیں۔ شیکسپیئر کے ڈراما نگار ہونے پر اعتراض اور شک وشبہ کرنے والے لوگ بڑے شدومد سے یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اتنی معمولی رسمی تعلیم رکھنے والا شخص ایک غیر معمولی تخیل اور تعمیری فکر کی حساسیت اور شعور کے ساتھ شاعرانہ قوت اور زور کا اظہار کیسے کر سکتا ہے؟ (جس کی شہادت شیکسپیئر کے ڈراموں کی نگارش میں ملتی ہے) شدید بدگمانی نے 19 ویں صدی میں اس وقت سر اٹھایا جب شیکسپیئر کی بطور ڈراما نویس عزت، تکریم اور تحسین وتعریف اپنے عروج پر تھی۔

شیکسپیئر کی تحقیر اور تنقیص

20 ستمبر 1952ء کو تاجروں کی تنظیم کے ایک کتابچے کے ایڈیشن میں لندن کے ڈرامہ نویس رابرٹ گرین کا ایک مقالہ طبع ہوا ہے جس میں ولیم شیکسپیئر پر تیر ونشتر چلائے گئے ہیں، اس کی چبھتے ہوئے اور نامناسب الفاظ میں تحقیر اور تنقیص کی گئی ہے۔ اس مقالہ میں رابرٹ گرین یوں رقم طراز ہے۔

ایک نو دولتیا، کائیں کائیں کرتا ہوا شیخی خورا، چھچھورا جس نے ہمارے ہی بخشے ہوئے پروں سے خود کو سجا لیا ہے۔ اسے یہ زعمِ باطل ہے کہ وہ بڑے بڑے الفاظ والی عبارت آرائی سے غیر مقفیٰ نظمِ معریٰ کے بارے میں ہم سے بہتر انداز میں بات کر سکتا ہے اور یہ کہ اس ملک میں صرف ایک ہی Shake Seen ہے جو ایسا کر سکتا ہے

اُس دور کے صاحبانِ علم وفضل اور اہل الرائے کا رابرٹ گرین کی شیکسپیئر کے بارے میں اس حرف گیری اور تنقیص پر اختلاف رائے ہے۔ تاہم ان کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ رابرٹ گرین کا گفتگو کا یہ انداز اس بات کا غماز ہے کہ شیکسپیئر اپنے سے زیادہ معروف، تعلیم یافتہ اور تجربہ کار ڈرامہ نگاروں مثلاً کرسٹوفر مارلو، تھامس نیشے اور خود رابرٹ گرین سے برابری کرنے کی کوشش کیوں کر رہا ہے۔

شیکسپیئر کی تحقیر کرنے اور اسے بدنام کرنے والے اپنی دانست میں اس بات کے قائل ہیں کہ جو پُختہ شہادت سٹریٹ فورڈ سے اس کے بارے میں ملتی ہے وہ صرف یہ بیان کرتی ہے کہ شیکسپیئر نے ایک بہت ہی عاجزانہ زندگی کا آغاز کیا۔ نوجوانی میں شادی کر لی اور پھر زمین اور غیر منقولہ جائیداد کے کاروبار میں کامیابی حاصل کر لی۔

1957ء میں قائم ہونے والی شیکسپیئر آکسفورڈ سوسائٹی نے شیکسپیئر کی مخالفت میں یہ دلائل پیش کئے کہ شیکسپیئر کے ڈراموں اور نظموں کا اصل مصنف ارل آف آکسفورڈ Edward De Vere ہے۔ اس دعوے کے ثبوت میں وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ ایڈورڈ شاہانہ اشرافیہ کے طمطراق (شان وشوکت) کے بارے میں وسیع مشاہدہ رکھتا تھا اور اسے حقیقت حال سے گہری واقفیت حاصل تھی۔ (جو شیکسپیئر کو مہیا نہ تھی) ایڈورڈ کی تعلیم' اس کی شاعری کی بناوٹ' ساخت اور اندازِ نگارش کی مشابہت اور مماثلت اس سے ملتی ہے جو شیکسپیئر کی شاعری اور ڈرامائی تحریروں کا خاصہ ہے۔ یہ اصحاب مزید بطور حجت یہ کہتے ہیں کہ شیکسپیئر کی نہ تو تعلیم اور نہ ہی ادبی تربیت کہ وہ فصیح و بلیغ نثر لکھ سکتا اور اس قدر زرخیز اور صلاحیتوں سے بھرپور کردار نگاری کر سکتا۔

تاہم شیکسپیئر کے محققوں اور سکالروں کی بڑی اکثریت تکرار کے ساتھ اپنے اس دعوے پر زور دیتی ہے کہ شیکسپیئر نے اپنے ڈرامے خود ہی لکھے ہیں وہ اس نقطے کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ شیکسپیئر کے علاوہ اس دور کے کچھ اور ڈراما نویس بھی بہت خاکسار قسم کا پسِ منظر رکھتے تھے اور ان کے بارے میں بھی معلومات بہت ناکافی تھیں لیکن ان پر شیکسپیئر کی طرح یہ اعتراضات نہیں کئے گئے۔

مزید ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ سٹریٹ فورڈ کے نیو گرامر سکول (جس میں شیکسپیئر نے داخلہ لیا تھا) میں لاطینی اور قدیم یونانی ادب کا نصاب بھی پڑھایا جاتا تھا جو ادیبوں اور مصنفوں کو اپنی تحریروں کے لئے بڑی اچھی اور مضبوط بنیاد فراہم کرتا تھا۔

شیکسپیئر کے حامیوں اور مدافعت کرنے والوں کی یہ دلیل بھی ہے کہ اس کی زندگی کی ناکافی معلومات کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کی زندگی کا کوئی وجود نہ تھا بلکہ وہ اس بات کی تصدیق بطور ثبوت پیش کرتے ہیں کہ اس کی شائع شدہ نظموں اور ڈراموں کے مجموعوں کے سرِ ورقوں پر بطور مصنف شیکسپیئر کا نام بڑے نمایاں اور جلی حروف میں طبع ہے۔

ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ شیکسپیئر کے ہم عصر مصنفوں اور نقادوں نے اسے Comedy of Errors,King John اور Two Gentlemen of Verona کا اصل مصنف تسلیم کیا ہے۔

1601ء کے شاہی ریکارڈ سے ثابت ہوتا ہے کہ ولیم کو King's Men کی تھیٹریکل کمپنی کے ممبر کی شناخت حاصل تھی۔ اس کے علاوہ اسے King John 1 کے انگریزی شاہی گھرانے کا ایک افسر مقرر کیا گیا تھا۔ وہ شاہی دربار کے چیمبر کا دلہا تھا جہاں کمپنی نے شیکسپیئر کے سات ڈرامے پیش کئے۔ اس کے علاوہ بہت ٹھوس قرائن پر مبنی (واقعاتی) شہادت موجود ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ شیکسپیئر کے اپنے ہم عصروں سے بطور اداکار اور ڈرامہ نگار ذاتی تعلقات تھے اور ان سے میل ملاپ بھی تھا۔

چنانچہ موزوں اور صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ ولیم شیکسپیئر ڈرامائی فنون کا ایک قابل تعظیم انسان تھا جس نے 16 ویں اور 17 ویں صدی میں نہ صرف ناقابلِ فراموش ڈرامے تحریر کیے بلکہ سٹیج پر پیش کش کے دوران ان ڈراموں میں اداکاری کے جوہر بھی دکھائے۔

تاہم اس کی غیر معمولی ذہانت' تخلیقی قوت اور اختراعی قابلیت کو 19

ویں صدی تک قدر شناسی سے محروم رکھا گیا۔ 1800 کے اوائل میں رومانوی دور کے آغاز کے ساتھ اور وکٹورین دور کے پورے عرصہ میں شیکسپیئر اور اس کی کارکردگی پر تحسین و آفرین اپنے معراج کو پہنچ گئی۔

بیسویں صدی میں شیکسپیئر کی علمیت اور کارکردگی کی نئی تحریکوں نے اِسے پھر سے نئے سرے سے دریافت اور قبول کیا۔

ہر زمانے میں اِس کے ڈرامے بے حد پسندیدہ اور مقبولِ عام رہے ہیں۔ مستقل زیرِ مطالعہ رہتے ہیں ان کی کارکردگی کو نئی تشریحات اور تفسیرات سے نوازا جاتا ہے۔ نئے مفہوم پیش کئے جاتے ہیں۔ مختلف' نوع بنوع' رنگا رنگ' ثقافتی ماحول اور سیاسی حقائق کی روشنی میں اس کے ڈراموں کی نئی وضاحتیں اور ترجمانیاں پیش کی جاتی ہیں۔

ہالی ووڈ اور بالی ووڈ میں ان ڈراموں پر مبنی براہِ راست فلمیں بن رہی ہیں یا ان کے قصوں سے اخذ کردہ کہانیوں پر فلمیں پیش کی جارہی ہیں۔ ان اداکاروں میں جنہوں نے ہیملٹ کا مرکزی کردار ادا کیا ہے ایک روسی اداکار ہیں جن کو کارکردگی میں سرِ فہرست تسلیم کیا جاتا ہے۔ برطانوی Lawrence Olivier جس نے ہیملٹ کے علاوہ شیکسپیئر کے ڈراموں پر بنائی گئی متعدد فلموں میں اداکاری کی ہے اسے Sir کے اعزاز سے نوازا گیا ہے۔ وہ اب Sir Lawrance Olivier کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے۔

شیکسپیئر کے ڈراموں کے کرداروں کی غیر معمولی ذہانت اور اس کے ان ڈراموں کے اصل قصے اور کہانیوں کے Plot (خاکے' نقشے) اس حقیقت کے گواہ ہیں کہ وہ بنی نوعِ انسان کے جذباتی احساسات' کیفیات اور شعور کی کشمکش' تضاد' تصادم اور اختلاف جیسے رویوں کی بڑی فطری' حقیقی' واضح اور وسیع ترجمانی پیش کرتے ہیں۔

شیکسپیئر کی مورتی

شیکسپیئر کا سب سے زیادہ مستند اور مصدقہ رنگین مجسمہ ہولی ٹرینٹی چرچ سٹیٹ فورڈ میں نصب ہے۔ یہ ساؤتھ وارک میں جیرارڈ جانسن کی ورکشاپ میں رنگ و روغن سے تیار کیا گیا ہے۔

شیکسپیئر کے ڈرامے

شیکسپیئر نے کُل 37 ڈرامے تحریر کئے ہیں۔ ان ڈراموں کو تین واضح قسموں میں بانٹا جاسکتا ہے۔

طربیہ Comedies	:	17
المیہ Tragedies	:	10
تاریخی Historical	:	10

طربیہ Comedies (17)

Phase I (1584 - 1594)

	Comedy of Errors
1584-1592	Taming of the Shrew
	Two Gentlemen of Verona
1592-1594	Love's Labour Lost

Phase II (1594 - 1599)

	A Midsummer Night's Dreams
	Merchant of Venice
1594-1599	Merry Wives of Windsor
	Much Ado About Notling
	As You Like It
	Twelfth Night

(10)Historical تاریخی

Phase I (1584 - 1592)

The first part of King Henry, the sixth

1584- The Second part of King Henry, the sixth

1592 The Third part of King Henry, the sixth

King Richard, the Third

King John

Phase II (1594 - 1599)

King Richard, the Second

1594- The First Part of King Henry, the Fourth

1592 The Second Part of King Henry, the Fourth

King Henry, the Fifth

Phase III (1608 - 1613)

1608-1613 King Henry, the Eighth

شیکسپیئر کا اندازِ تحریر

شیکسپیئر کے پہلے دور کے لکھے ہوئے ڈرامے اس وقت کے رسمی، رواجی، تقلیدی، مبالغہ آمیز، خطیبانہ اور فنِ خطابت کے انداز میں لکھے گئے ہیں جن میں روزمرہ کے بامحاورہ اندازِ بیان میں، استعارہ، کنائیہ اور مجاز نمایاں اور غالب ہیں جو ڈرامے کے قصے، کہانی اور کرداروں کے ساتھ فطری طور پر ہم آہنگ نہیں ہیں اور نہ ہی ان سے میل کھاتے ہیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ شیکسپیئر ایک جدت پسند، طرزِ نو اور نئی راہ نکالنے والا ذہن رکھتا تھا۔ وہ روایتی انداز میں تصرف کر کے اسے اپنی ضرورت اور اپنے مقاصد کے مطابق ڈھال کر الفاظ کا ایک بے روک ٹوک آزاد بہتا

Phase III (1599 - 1608)

Troilus and Cressida

1599-1608 Measure for Measure

All is well that ends well

Phase IV (1608 - 1613)

Perciles

1608-1613 Cymbeline

Winter's Tales

Tempest

(10)Tragedies المیہ

Phase I (1584 - 1592)

1584-1592 Titus Andronicus

Phase II (1594 - 1599)

1594-1599 Romeo and Juliet

Phase III (1599 - 1608)

Julius Caeser

1599-1608 Hamlet

Othello

Timon of Athens

King Lear

1599-1608 Macbeth

Antony and Cleopatra

Coriolanus

ہوا چشمہ بنانا جانتا تھا۔اس کے تحریر کردہ تمام ڈراموں میں شاعری اور سادہ نثر کی عبارت کے ٹکڑے ملتے ہیں۔

تاریخی ڈراموں پر بات کرتے ہوئے مؤرخین اور نقاد وضاحت کرتے ہیں کہ شیکسپیئر نے یہ ڈرامے لکھ کر عہدِ شاہی کو حق بجانب ثابت کرنے کا جواز پیش کیا ہے۔اس کے طربیہ ڈرامے حسِ مزاح اور شگفتگی سے بھرپور ہیں۔اُس کے المیہ کھیلوں میں ڈراموں کے کردار انسانی مزاج اور افتادِ طبع کے ابدی اور عالمگیر تاثرات بڑے گہرے اور واضح انداز میں پیش کرتے ہیں۔اس ضمن میں اس کے المیہ ڈراموں میں سے ''ہیملٹ'' سب سے زیادہ پیش پیش ہے جو دغا' بے وفائی' غداری' سزا جزا' انتقام اور مکافاتِ عمل جیسے رویوں کی تحقیق اور تفتیش کرتا ہے۔ان اخلاقی قدروں کا دیوالیہ پن اور صلاحیتوں کا تنزل شیکسپیئر کے ڈراموں کے قصے' کہانی اور مسودے کے خاکے اور نقشے کو اس طرح بگاڑ کے رکھ دیتا ہے کہ وہ ڈرامے کے ہیرو اور اس کے چاہنے والوں کو نیست و نابود کر دیتا ہے۔

اپنے آخری دور میں شیکسپیئر نے بہت سی Tragicomedies لکھیں۔ یہ ایسے ڈرامے ہیں جن میں غم اور خوشی کا ملا جلا رنگ پایا جاتا ہے۔تاہم یہ المناک ڈرامے نہیں ہیں کیونکہ ان ڈراموں کا انجام مصالحت' موافقت' تصفیہ' بخشش' رحمدلی اور معاف کر دینے کی صلاحیت پر ہوتا تھا۔

وصیت

شیکسپیئر نے اپنی وصیت کے مطابق اپنی تمام جائیداد' ملکیت اور دولت کا ایک کثیر حصہ اپنی سب سے بڑی بیٹی Susanna کے لئے وقف کر دیا۔ اگرچہ اس کی بیوی Anne اس کی وراثت کے ایک تہائی حصے کی مستحق اور حقدار تھی تاہم اس نے اپنی بیوی کے لئے وراثت میں صرف دوسرا بہترین پلنگ Second best bed چھوڑا۔ چنانچہ اس پر بہت سی قیاس آرائیوں نے جنم لیا کہ یہ جوڑا آپس میں بہت جڑا ہوا نہیں تھا یا یہ کہ این اپنے شوہر شیکسپیئر کے پیار اور محبت سے محروم ہو رہی تھی تاہم اس بات کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ ان دونوں کی شادی مشکلات یا اختلافات کا شکار تھی۔اس سلسلے میں بعض محققین توجہ دلاتے ہیں کہ Second best bed کی اصطلاح عموماً اس پلنگ کے لئے مخصوص ہے جو سہاگ رات والا پلنگ ہوتا ہے اور جو صرف خاندان کے سربراہ اور اس کی بیوی کے استعمال کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔The first best bed گھر کے مہمانوں کے لئے وقف ہوتا ہے۔

انتقال

ایک روایت کے مطابق شیکسپیئر کا انتقال 52 سال کی عمر میں اس کی سالگرہ کے دن یعنی 23 اپریل 1616ء کو ہوا۔تاہم بعض محققین اسے محض ایک فرضی اور خیالی قصہ قرار دیتے ہیں۔ٹرینیٹی چرچ کے ریکارڈ کے مطابق شیکسپیئر کو اس گرجا گھر میں 5 اپریل 1616ء کو دفن کیا گیا۔ جیسا کہ اس سے پہلے پچھلے صفحات میں ذکر ہوا ہے کہ شیکسپیئر کا سب سے زیادہ مستند اور مصدقہ رنگین مجسمہ اسی چرچ میں نصب ہے۔

حوالے:

1. Collins–Complete Works of Shakespeare
2. AC Bradley–Shakespearean Tragedy
3. Nathanial Harris–The Age of Schakespeare
4. Pelican Guide to English Literature-Vol-2 The Age of Shakespeare
5. C Carter Colwell–A Student's Guide to Literature
6. Brandon Buxton–Shakespeare Alive-Book-2
7. Germain Creer (Australian Writer–Author of five books) Biography of Shakespeare

اسلم بزمی

نسخہ شادمانی

انسان ہمیشہ سے خوشی اور سکون کا متلاشی رہا ہے ۔ خوشی کا تعلق جسمانی عوامل سے نہیں بلکہ انسان کے ذہنی رویے سے ہے۔آپ نے ایسے لوگ ضرور دیکھے ہوں گے جنہیں بہترین نعمتوں کا حصول بھی خوشی نہیں دے سکتا۔دیکھا جائے تو اصل قصور انکے منفی ذہنی رویے اور مایوسانہ سوچ کا ہے جو ناشکری،تشکیک، ہوس، انا پرستی، حسد اور بغض جیسی اخلاقی بیماریوں سے جنم لیتا ہے۔انسان کے لیے اپنے دکھوں پر قابو پانا اور ایک حقیقی پر مسرت اور مطمئن زندگی گزارنا قطعاً ناممکن نہیں مگر اس کے لیے حقیقت پسندانہ سوچ اپنانے ،غور وفکر کرنے اور اپنے زاویہء نظر میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے ۔ یہ آپ کا زاویہء نظر ہی ہے جس کے باعث آپ محسوس کرتے ہیں کہ گلاس آدھا خالی ہے یا آدھا بھرا ہوا۔ سچی خوشی کا تعلق نہ تو طاقت سے ہے ، نہ دولت سے اور نہ ہی آپ کے معاشرتی رتبے سے۔وہ لوگ جو دولت کے انبار اکٹھے کرنے کو ہی خوشی کا ذریعہ سمجھتے ہیں، بہت جلد لالچ اور ہوس کی ایسی دلدل میں دھنسنے لگتے ہیں جس کی گہرائی کا انہیں خود بھی ادراک نہیں ہوتا۔تاج پہننے والے راتوں کو پُر سکون نہیں سو سکتے۔کینٹکی (Kentucky) کے رہنے والے اس جوڑے کی داستانِ عبرت ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے جو نہ صرف اچانک ملنے والی دولت کو ضائع کر بیٹھے بلکہ آپس میں علیحدگی اور طلاق کے بعد پانچ سال کے اندر دونوں لقمہ اجل بن گئے۔سمجھدار لوگوں کے نزدیک خوشی کوئی بیرونی وجود نہیں رکھتی بلکہ یہ انسان کے اندر موجود ہوتی ہے۔

خوشی کیا ہے؟

خوشی دراصل زندگی سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت کا دوسرا نام ہے۔ صورت حال جو بھی ہو اگر ہم اس پر مطمئن ہوسکیں تو خوشی ہمارا مقدر بن جاتی ہے۔انسان بہت سی ایسی چیزوں سے صَرفِ نظر کرتا ہے جو اسے نہایت فراوانی سے میسر ہوں اور جو اس کے لیے بے پایاں خوشی کی حامل ہوں مثلاً محبت کا ملنا اور محبت کرنے کی صلاحیت، اچھے دوستوں کی رفاقت ،گھومنے پھرنے کی آزادی اور اپنی پسند کی جگہ کا انتخاب اور سب سے بڑھ کر صحت اور اس سے حاصل ہونے والی توانائی۔یہ ضرور ہے کہ خوشی کسی دائمی کیفیت کا نام نہیں۔مضمون نگار ہف پراتھر (Hugh Prather) کے بقول یہ لاینحل مسائل، ناممکن فتوحات اور سمجھ میں نہ آنے والی ناکامیوں کے درمیان اچانک آنے والے اس مختصر وقفے کا نام ہے جو چاہے چند لمحوں پر محیط ہو، اپنے جلو میں کامل اطمینان لے کر آتا ہے۔آپ نہیں کہہ سکتے کہ کب اچانک آپ اس لمحے کو اپنے اُوپر طاری ہوتے ہوئے محسوس کریں گے۔ بقول ہیلن کیلر (Helen Keller) جب خوشی کا ایک دروازہ ہم پر بند ہوتا ہے، عین اُس وقت ایک اور دروازہ کھلتا ہے مگر اکثر ہم اس بند دروازے کو دیر تک ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہتے ہیں تا آنکہ وہ دوسرا دروازہ بھی بند ہو جاتا ہے۔

The Power of Intention کے مصنف ڈاکٹر وین ڈائیر (Dr. Wayne W. Dyer) کی یہ بات قابل غور ہے کہ ہمیں دنیا

میں دُکھ اٹھانے اور خوف و مایوسی کا سامنا کرنے کے لیے نہیں بھیجا گیا۔ ذرا کم سن بچوں کی زندگی پر نظر ڈالیے؛ وہ خوشی حاصل کرنے کے لیے کوئی ارادی کوشش نہیں کرتے' نہ وہ کام کرتے ہیں اور نہ بڑی بڑی خواہشات پالتے ہیں۔ بس وہ اس بے کراں دنیا میں پھیلی ہوئی حیرتوں کو کھوجنے میں لگے رہتے ہیں۔ وہ سب سے محبت کرتے ہیں۔ چھوٹی سے چھوٹی بات انہیں خوشی دے سکتی ہے۔ مثلاً پلاسٹک کی چھوٹی بوتل، ایک معمولی سا کھلونا یا کوئی مزاحیہ سا چہرہ۔ ان کی خوشی کا راز فطرت کے ساتھ ان کی ہم آہنگی میں ہے۔ لہٰذا ہمارے لیے بھی ضروری نہیں کہ ہم خوش رہنے کے لیے کوئی خاص وجہ تلاش کریں۔ بس خوش رہنے کی طلب اور خواہش ہی کافی ہے۔

بدقسمتی سے انسانوں کے ایک کثیر طبقے نے خوشی کو بھی باقی مادی اشیاء کی مانند سمجھ لیا ہے جنہیں حاصل کرنے کے لیے انتھک کوششیں کرتے ہیں۔ خوشی کو دولت اور دنیاوی کامیابیوں میں تلاش کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں اور اس بات کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں کہ لازمی نہیں تمام دولت مند اور کامیاب لوگ خوش بھی ہوں۔ خوشی آسائشوں کے حصول میں نہیں بلکہ کسی اعلیٰ نصب العین کے ساتھ آپ کی وابستگی اور لگن میں پوشیدہ ہے۔ یہ اس مقصد کے لیے مسلسل جاری رہنے والی جدوجہد اور مستقل احساسِ تشکر کا نام ہے۔

درست سمت کا انتخاب

اگرچہ خوشی کا حصول ہمیں پہلے کی نسبت مشکل دکھائی دیتا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ اس کو حاصل کرنے کے طریقے میں صدیوں سے کچھ تغیر واقع نہیں ہوا۔ ایسا نہیں ہے کہ کچھ اضافی چیزوں کا حصول آپ کو خوشی دے سکتا ہے بلکہ اس کا تعلق اس بات سے ہے کہ جو کچھ آپ کے پاس ہے یا جو کچھ آپ کے ساتھ پیش آتا ہے، آپ اُسے کس زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

لِن پیٹر (Lyn Peter) کے مطابق اگر آپ منفی سوچ کو مثبت سوچ سے بدل دیں اور ہر ناکامی کا مقابلہ کریں تو خوشی آپ کی پہنچ سے دور نہیں۔

آگے بڑھنا اور ترقی کرنا انسان کا فطری جذبہ ہے۔ مسئلہ تب پیدا ہوتا ہے جب آپ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے دیانت اور اخلاقیات کے بنیادی اُصولوں کو نظر انداز کرنا شروع کرتے ہیں۔ مادی فوائد کے حصول کی اس دوڑ میں سب سے پہلا خون اخلاقیات ہی کا ہوتا ہے۔ بہت کم لوگ یہ جان پاتے ہیں کہ سر توڑ کوششوں کے بعد اگر آپ یہ دوڑ جیت بھی لیں تو یہ کامیابی، آپ کو کوئی اخلاقی برتری نہیں دلاتی۔ انسان چونکہ فطرتاً کوتاہ نظر واقع ہوا ہے لہٰذا وہ اس حقیقت کا عموماً ادراک نہیں کر پاتا کہ تمام تر منصوبہ بندی اور جدوجہد کے باوجود ہماری کامیابی ہماری تقدیر سے مشروط ہے۔ اللہ پر یقین اور دیانتدارانہ جدوجہد ہی وہ واحد راستہ ہے جو نہ صرف ہماری سوچ کو مثبت بنانے پر منتج ہوتا ہے بلکہ ہماری سمت بھی درست کرتا ہے۔

اگر مستقبل کی تعمیر کا اختیار ہمارے اپنے ہاتھ میں ہوتا تو ہم میں سے ہر کوئی بلند ترین منصب پر پہنچ کر ہی دم لیتا۔ کتنی ہی ایسی مثالیں ہمارے سامنے ہیں کہ جب بہت سے غیر معمولی انسان جو اپنے کیریئر کی بلندیوں کو چھوتے دکھائی دیتے تھے، اچانک موت یا کسی جسمانی یا ذہنی بیماری کے باعث عین اس وقت ناکامی کا شکار ہو گئے جب لبِ بام محض دو چار ہاتھ رہ گیا تھا۔ ہمارے منصوبے اور ہماری کوششیں کتنی ہی موثر کیوں نہ ہوں، تقدیر کو شکست نہیں دے سکتے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم قنوطیت کا رویہ اپنا لیں اور ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھ جائیں۔ تاہم ہمیں یہ ضرور سمجھ لینا چاہیے کہ اپنے کیریئر یا دیگر دنیاوی معاملات کی فکر میں ہر وقت گھلتے رہنا کارِ لاحاصل ہے۔ درست رویہ یہ ہوگا کہ ہم بھرپور کوشش

کرنے کے بعد اس کا نتیجہ رب العزت پر چھوڑ دیں کیونکہ ہماری کامیابی یا ناکامی کا اصل ادراک اسی کو ہے۔

اگر ہم بنی نوع انسان کو عموماً درپیش پریشانیوں اور اسکی بے سکونی کے پسِ منظر میں جھانکنے کی کوشش کریں تو اس کے پیچھے حد سے بڑھی ہوئی مادی خواہشات دکھائی دیں گی ۔ قناعت کی کمی اپنے ساتھ بے شمار جسمانی، ذہنی اور جذباتی مسائل لاتی ہے۔خود اپنے منفی رویے کے نتیجے میں ہم خوف اور نا امیدی کا شکار ہو جاتے ہیں ۔ یہ سب چیزیں مل ملا کر ہماری استعداد بھی متاثر کرتی ہیں، مزاج میں بھی کڑواہٹ بھرتی ہیں اور مجموعی طور پر زندگی کو سعیِ لا حاصل بنا دیتی ہیں۔دوسرے لفظوں میں جدید معاشرے میں بدامنی اور افراتفری جدید انسان کے باطن میں پائی جانے والی بے اطمینانی کا براہ راست نتیجہ ہے۔خواہشات کی کثرت اور خدا پر ایمان کی کمی اکثر اسے خود اپنے مقابل لا کھڑا کرتی ہے اور وہ ایسی روش پر چل نکلتا ہے جو اسی کے نقصان پر منتج ہوتی ہے۔

کمپیوٹر کے اس دور میں زندگی کی تھکا دینے والی طوفانی رفتار کو ہم کم نہیں کر سکتے لیکن اپنے رویے میں مثبت تبدیلی لا کر جدید دور کے ساتھ آنے والی پریشانیوں کو کم ضرور کر سکتے ہیں۔کسی نے درست کہا ہے کہ زندگی کا صرف دس فیصد حصہ ہمارے ساتھ پیش آمدہ واقعات پر مشتمل ہے جبکہ باقی کا نوے فیصد ان حالات و واقعات پر ہمارے ردِعمل سے عبارت پاتا ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ زندگی پر اپنا اعتماد بحال کیا جائے۔ یہ سمجھنا ضروری ہے کہ زندگی دراصل ایک راز ہے اور اس راز کا سرا ہمارے ہاتھ میں نہیں۔

مستقل، مسلسل اور درست سمت میں کوشش کے ذریعے انسان ہمیشہ حیران کن کامیابیاں حاصل کرتا رہا ہے اور آئندہ بھی کرتا رہے گا' لیکن یاد رہے کہ کامیابیوں کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے حصے کی ناکامیاں بھی سمیٹنا پڑتی ہیں۔اصل آزمائش یہ ہے کہ انسان مایوسی سے مغلوب ہوئے بغیر حقائق کو تسلیم کر کے ان کا سامنا کرے۔روح کی توانائی، ارفع مقاصد کے حصول اور کامیابی کے لیے مشکلات کے صبر آزما مرحلے سے گزرنا ناگزیر ہے۔آزمائشوں کے دوران پراعتماد اور پرسکون رہنا ہی جری افراد کی پہچان ہے۔فطرت کبھی مثبت سوچ اور اچھی نیت رکھنے والے افراد کو محروم نہیں رکھتی اور انہیں ایسے انداز سے نوازتی ہے جس کی انہیں خود بھی توقع نہیں ہوتی۔

صبح کے وقت اڑان بھرتے پرندوں اور رنگا رنگ پھولوں پر منڈلاتی تتلیوں کا نظارہ کس قدر تسکین بخشتا ہے۔ہم نے خود اپنی زندگیوں میں لالچ اور حرص کا زہر بھر رکھا ہے۔ جوں جوں ہمیں فطرت کی طرف سے زیادہ سے زیادہ نعمتیں ملتی ہیں، توں توں ہمارے شکووں کے انبار بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ناشکری کا یہی وہ رویہ ہے جو ہمارے دلوں میں سکون کی سرایت کو روکتا ہے۔

آیئے اب ان عوامل پر ایک نظر ڈالتے ہیں جو خوشی کی تلاش میں ہمارے مددگار ہو سکتے ہیں۔

اپنا رویہ تبدیل کیجئے

ایک یاسیت پسند شخص کے لیے زندگی محض دکھوں اور تاریکیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے جبکہ رجائیت پسند شخص مایوسی کے اندھیروں میں بھی امید کی کرن تلاش کر لیتا ہے۔ہم سب زندگی میں مختلف قسم کے بحرانوں، ناکامیوں اور پریشانیوں کا شکار ہوتے ہیں۔ایک دانشمند انسان ناکامیوں سے سیکھ کر زیادہ توانا شخص بن کر ابھرتا ہے۔مسائل کا نہ ہونا ہرگز خوشی کی علامت نہیں ۔ بلکہ *The Path of Ethical*

Management کے شریک مصنف نارمن ونسیٹ پیل (Norman Vincet Peale) کے بقول ایسے شخص کو جسے کوئی مسئلہ درپیش نہیں، فوراً تنہائی میں جا کر سوچنا چاہیے کہ آخر اللہ تعالیٰ نے اسے مسائل اور چیلنج بھیجنے کیوں بند کر دیئے ہیں۔ کیا اللہ تعالیٰ کو اس پر اعتماد نہیں رہا؟ اللہ کی بنائی ہوئی تقدیر پر ایمان، زندگی کی افادیت پر یقین اور اللہ تعالیٰ کی رحمت پر غیر متزلزل اعتماد ہمیں قناعت اور خوشی کا وہ بے پایاں احساس بخشتے ہیں جو مشکل ترین لمحوں میں بھی ہمارے قدموں کو ڈگمگانے نہیں دیتا۔

زندگی کو بامقصد بنایئے

زندگی میں کسی مشن کو اپنانا ضروری ہے۔ یہ چیز آپ کو آپ کی اصل شناخت اور ترجیحات کے تعین میں مدد دیتی ہے۔ یہ جذبات کا ایک رُخ متعین کرتی ہے، ہمیں اپنی پوشیدہ توانائیوں کا شعور فراہم کرتی اور ہماری زندگی کو اس طرز پر ڈھالنے میں ہماری مدد کرتی ہے جیسا فطرت اسے بنانا چاہتی ہے۔

میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ میں خود کو سب سے زیادہ مطمئن اور مسرُور اُس وقت محسوس کرتا ہوں جب میں تحریر کے ذریعے تخلیقی عمل میں مصروف ہوتا ہوں۔ میری خواہش ہوتی ہے کہ میں لوگوں کی زندگیوں میں مثبت تبدیلی لانے کا ذریعہ بن سکوں۔ اگر میں اپنے مشن کو الفاظ میں بیان کروں تو وہ کچھ اس طرح ہے؛ ایک ہمدرد اُستاد اور سچ لکھنے والا ادیب بننا اور لوگوں میں یہ شعور بیدار کرنا کہ اللہ تعالیٰ کی بے پایاں عنایتوں نے ان کی زندگیوں کا کس طرح احاطہ کیا ہوا ہے۔ ایک ایسا شخص جس کی زندگی کسی اعلیٰ مقصد سے خالی ہو، ایسے جہاز کی مانند ہے جس کی منزل متعین نہ ہو۔ آپ کی اخلاقیات کی تعمیر آپ کا نصب العین ہی کرتا ہے۔ ایک لمحے کے لئے سوچیے کہ اپنی موت کے بعد آپ کس حیثیت میں اور کس حوالے سے لوگوں کے دلوں میں باقی رہنا چاہتے ہیں۔ بس سمجھ لیجیے کہ یہی آپ کا نصب العین ہے اور یہی آپ کی پہچان ہے لہٰذا اس کے حصول کے لیے ابھی سے کام شروع کر دیجیے۔

نوبل انعام کے بانی الفریڈ نوبل (Alfred Nobel) کی بڑی دلچسپ اور قابلِ عمل مثال اس سلسلے میں ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ جب اس کے بھائی کا انتقال ہوا تو اخبارات میں غلط فہمی کی بنا پر خود اس کے انتقال کی خبر چھپ گئی۔ اُسے یہ دیکھ کر مزید صدمہ ہوا کہ اخبارات میں ڈائنامائٹ کی ایجاد کو اس کے سب سے بڑے حوالے کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ اس نے اسی وقت فیصلہ کیا کہ اس کی پہچان بارود کی بجائے امن کے حوالے سے ہونی چاہیے۔ چنانچہ آج دنیا اُس کو نوبل امن انعام کے حوالے سے جانتی ہے۔

زندگی کو سادہ بنایئے

سادگی میں آسانی بھی ہے، کشش بھی اور لطف بھی۔ زندگی میں ہر لحظہ بڑھتے ہوئے تصنع نے ہمیں فطرت سے بہت دور کر دیا ہے۔ آسائشوں کی فراوانی جہاں ہماری جیب پر بوجھ بنتی ہے وہاں ہماری روح کو بھی اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہے۔ تن آسانی اور تعیش پسندی اپنے ساتھ پریشانیاں اور خطرات لے کر آتی ہے۔ سہولیات کی حد سے بڑھی ہوئی خواہش اپنے آپ کو جائز ذرائع تک محدود نہیں رکھتی۔ ان چیزوں کے خواہش مند یا تو ناجائز ذرائع اختیار کرتے ہیں یا دوستوں اور بینکوں سے قرضے لینے کا راستہ اختیار کرتے ہیں اور یوں مختلف قسم کے تفکرات، مالی پریشانیوں، سماجی مسائل اور جسمانی اور نفسیاتی عوارض کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ہم اکثر اوقات ایسی چیزیں خرید لیتے ہیں جن کی ضرورت ہمیں شاذ و نادر ہی پڑتی ہے یا پھر ہماری خریداری ہماری ضرورت سے کہیں بڑھ کر ہوتی ہے ۔ نام نہاد رعایتی سیل کے اشتہارات بہت سارے لوگوں کو ضرورت سے زیادہ خرچ پر مجبور کر دیتے ہیں ۔ نہ صرف ہم ان زائد از ضرورت اشیاء کی خریداری میں اپنا قیمتی وقت صرف کرتے ہیں بلکہ یہ رویہ ہمارے گھریلو بجٹ کو غیر متوازن بنانے کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔ اگر ہم اپنی چادر کے مطابق پاؤں پھیلانے کی عادت اپنالیں تو اس سے ہمارے ذہن اور ہماری جیب دونوں پر بوجھ کم ہوگا۔

اگر ہم اپنی زندگی کو ضرورت سے زیادہ پیچیدہ نہ بنائیں اور غیر معمولی خواہشات کے پیچھے نہ بھاگیں تو نہ صرف بہت سا وقت اور توانائی بچا سکتے ہیں بلکہ اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا موقع بھی فراہم کر سکتے ہیں ۔ اگر ہم روزانہ دس پندرہ منٹ تنہائی میں غور و فکر کی عادت اپنا لیں تو یہ بہت مفید ثابت ہوسکتا ہے۔ ہم اپنے خالق سے جتنا زیادہ شعوری تعلق استوار کریں گے اتنا ہی زیادہ ہم خود اپنی پہچان کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔

شکر گزاری کا رویہ اپنائیے

زندگی کو سکون اور اطمینان کے سائے میں گزارنے کے لیے ضروری ہے کہ چیزوں کا روشن پہلو دیکھنے کی عادت اپنائی جائے ۔ جو انسان ایسا رویہ اپنا لیتا ہے وہ اس وقت بھی مطمئن رہتا ہے جب اس کی خواہشات پوری نہیں ہوتیں ۔ زندگی کے تاریک ترین لمحات بھی یہ تقاضا کرتے ہیں کہ ان کے اندر چھپی ہوئی روشنی اور امکانات کو تلاش کیا جائے ۔

ہر کام اللہ تعالی کی مشیت سے ہوتا ہے اور اس کے پس پردہ کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے ۔ وہ ہمیں ہر نعمت مہیا کر سکتا ہے ۔ بس ہمیں اس کی رضا پر چلنے کی عادت ڈالنی پڑے گی ۔ تحسین کرنی ہوگی ہر اس چیز کی جو ہمیں دی گئی ہے، ہر اس چیز کی جس سے ہمیں واسطہ پیش آتا ہے ۔ ذرا نظر اٹھائیں! کتنی چیزیں ہماری تحسین کی منتظر ہیں ۔ وہ سانس جو ہم لیتے ہیں، وہ اعضا جو ہمارے جسم کے اندر ایک زبردست ہم آہنگ نظام سے مربوط ہو کر کام کر رہے ہیں، وہ خون جو ہماری رگوں میں دوڑ رہا ہے ۔ ہمارے گردے جو فاسد مادوں کو خون سے الگ کر رہے ہیں، ہمارا دماغ تین پونڈ وزن کا بجلی گھر ہے جو اربوں نیورونز سے مل کر بنا ہے اور جس کی مدد سے ہم یہ الفاظ لکھتے ہیں اور وہ آنکھیں جو ان کو پڑھتی ہیں اور ہمارا وہ دل جو ابھی تک دھڑک رہا ہے ۔ آئیں ان سب کا اور اس دھڑکتے ہوئے دل کا اور ان دھڑکنوں کے خالق کا شکر ادا کریں ۔ ایک احسان ناشناس انسان دنیا بھر کی دولت اور نعمتوں کے باوجود غریب رہتا ہے ۔ اگر ہم اپنا رویہ بدل لیں تو بہت سارے دکھ اور تفکرات خود ہی مٹ جائیں گے ۔ اس لیے کہ مطمئن اور مسرور زندگی کا راز شکر گزار رہنے میں ہے ۔ آئیں اس اللہ کا شکر ادا کریں جس نے ہمیں پیدا کیا اور پھر تحفوں اور نعمتوں کی بارش کر دی۔

صحت مند جسم، تخلیقی سرگرمیاں اور تفریح

صحت کی خرابی زندگی کی بہت ساری خوشیوں کا مزہ کرکرا کر دیتی ہے ۔ ایک بیمار شخص جو سونے، کھانے یا چلنے سے معذور ہو، بہت سی خوشیوں سے محروم رہتا ہے ۔ کھیل اور ورزش کے معمولات کی پابندی آپ کو صحت مند بھی رکھتی ہے اور مسرور بھی ۔ کام بہت بڑھ جائے تو تھوڑا سا وقفہ کرنا بہت مفید ثابت ہوتا ہے ۔ اس سے نہ صرف آپ کی کارکردگی میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ زندگی سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت بھی بڑھتی ہے ۔ چہل قدمی، دوڑ، پیراکی، سائیکلنگ جیسی ورزش جو ہمیں ورزش کے

ساتھ ساتھ سوچنے کا موقع بھی دیتی ہیں، ہماری روحانی توانائی کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اسی طرح کوہ پیمائی اور سیر و سیاحت بھی سود مند سرگرمیاں ہیں۔ انسان کے لیے کسی نہ کسی تعمیری مشغلے یا تخلیقی سرگرمی کو اختیار کرنا بہت ضروری ہے چاہے وہ تصویر کشی ہو، ادب ہو یا کچھ اور۔ ایسا کام کرنے کی کوشش کریں جو آج سے دس سال بعد بھی آپ کو یاد رہے۔ میں جب کبھی اپنی پرانی نظموں اور مضامین پر دوبارہ نظر ڈالتا ہوں تو ایک سکون اور عجیب سی خوشی کا احساس ہوتا ہے۔

مستقل مزاجی کا رویہ اپنائیے

بہت سے لوگ مختلف چیزوں میں دلچسپی رکھنے کے باوجود انکے حصول کے لیے مطلوبہ لگن نہیں رکھتے۔ وہ کام کرنے کی خواہش کا اظہار تو کرتے ہیں مگر حقیقت میں شاذ و نادر ہی اس کام کو انجام دیتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی صبح بارش ہو رہی ہو تو وہ فوراً فیصلہ کر لیں گے کہ آج ایکسرسائز نہیں ہو سکتی۔ مگر ایک مستقل مزاج شخص حوصلہ ہارنے کی بجائے اس نتیجے پر پہنچے گا کہ آج کھلی جگہ پر نہیں تو گھر کے اندر ہی ایکسرسائز کر لی جائے۔ زندگی کی بہت ساری ناکامیوں کے پس منظر میں مستقل مزاجی اور محنت کی کمی جھانکتی دکھائی دیتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کامیابی کا راستہ مشکلات سے اٹا پڑا ہے مگر حقیقی لگن اور مستقل مزاجی کے طفیل انسانوں نے زندگی کے ہر میدان میں حیران کن کامیابیاں حاصل کی ہیں۔

اپنے پیشے پر فخر کیجیے

اپنی ذات اور اپنے پیشے کے بارے میں منفی اور معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنے سے بچیں۔ بقول ایلینر روز ویلٹ (Eleanor Roosevelt) "کوئی بھی آپ کو کمتر ہونے کا احساس نہیں دلا سکتا جب تک آپ خود ایسا محسوس کرنا شروع نہ کر دیں"۔ سیکھنے اور اپنی تربیت کے عمل کے لیے ہمیشہ آمادہ رہیں۔ اگر لوگ آپ کے کسی عمل پر تنقید کریں تو اس چیز کو منفی انداز سے نہ دیکھیں۔ اپنی ذات پر اعتماد رکھتے ہوئے اپنے بارے میں لوگوں کی رائے جاننے کی کوشش کریں۔ اس کے نتیجے میں اپنے آپ کو بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ ہر پیشہ قابلِ تکریم ہے۔ جو شخص اپنے پیشے پر شرمندہ ہو، وہ اس پیشے کے لیے اور وہ پیشہ اس کے لیے بوجھ بن جاتا ہے۔ ایک اچھا پروفیشنل اپنے کام سے محبت کرتا ہے اور اس سے لُطف حاصل کرتا ہے۔ ایسے لوگ اپنے میدان کار میں ہمیشہ اعلیٰ ترین کامیابیوں کے حصول کی کوشش کرتے ہیں اور ایسے ہی لوگوں کو اپنے شعبے کے لیے ایک اثاثہ سمجھا جاتا ہے۔

التوا کی عادت سے بچیں

چیزوں کو التوا میں ڈالنے کی عادت وقت کے ضیاع کی بہت بڑی وجہ ہے۔ اگر اس پر قابو نہ پایا جائے تو یہ ایک ذہین فطین شخص کو بھی اوسط درجے کے انسان کے برابر لا کھڑا کرتی ہے۔ نامکمل کام کا بوجھ انسان کے لیے سوہان روح بن جاتا ہے۔ اس عادت کی وجہ سے کام اکٹھے ہوتے رہتے ہیں حتیٰ کہ انہیں مکمل کرنا ناممکن دکھائی دینے لگتا ہے۔ اس سے نہ صرف جلدی میں انجام دیے ہوئے کام کا معیار متاثر ہوتا ہے بلکہ ہمارے مزاج میں بھی تلخی کا عنصر شامل ہو جاتا ہے۔ کام کو وقت پر نمٹا دینے سے آپ ایسی پریشانی سے بچے رہتے ہیں۔ مشہور امریکی ماہر نفسیات ولیم جیمز (William James) کا کہنا ہے کہ التوا میں ڈالے گئے کاموں کو نمٹانے کے لیے اپنے آپ کو مجبور کرنا چاہیے۔ دن کا آغاز ایسے کام سے کریں جو آپ کو سب سے زیادہ ناخوشگوار لگتا ہو مثلاً کسی سے کسی بات

پر معذرت کرنا جو آپ کو بہت پہلے کر لینی چاہیے تھی۔ نتیجتاً آپ نسبتاً کم ناخوشگوار کام آسانی سے نمٹا لیں گے اور دن کے آخر میں اطمینان محسوس کر سکیں گے۔

کام کو سر پر سوار نہ کیجئے

بعض لوگ کام کو اس طرح سر پر سوار کر لیتے ہیں کہ چھٹیوں میں بھی اور اختتامِ ہفتہ کی تعطیل پر بھی کام کا بھوت ان کے سر سے نہیں اترتا۔ نتیجتاً اہل خاندان سے فاصلہ پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اگر کام کا دورانیہ زیادہ طویل ہو جائے اور درمیان میں وقفہ نہ دیا جائے تو ذہنی اور جسمانی تھکن کام کی رفتار کو سست کر دیتی ہے اور کام کا معیار بھی منفی طور پر متاثر ہوتا ہے۔

کام کے دوران مختصر وقفہ کر کے ہلکی سی ورزش یا کمرے میں چہل قدمی یا اپنی نشست کے انداز کو تبدیل کرنے سے جسم کو آرام ملتا ہے۔ یہ مختصر وقفہ نہ صرف ہماری کارکردگی کو بڑھاتا ہے بلکہ ہماری ذہنی، جذباتی اور جسمانی صحت کے لیے بھی نہایت اہم ہے۔ ایک مشہور کتاب *When Bad Things Happen to Good People* کا مصنف ربی ہیرلڈ کشنر (Rabi Harold Khushner) لکھتا ہے کہ میں نے کبھی بستر مرگ پر پڑے شخص کو یہ کہتے ہوئے نہیں سنا کہ کاش میں مزید کچھ دن اپنے دفتر جا سکتا۔ اس لمحے ایسے افراد کی سوچ عموماً یہ ہوتی ہے کہ کاش میں نے لوگوں سے زیادہ محبت کی ہوتی۔ کاش میں نے ان کا زیادہ خیال رکھا ہوتا۔ یہ حقیقت اس جانب ہماری رہنمائی کرتی ہے کہ خوشی کا اصل منبع کیا ہے۔

لوگوں کی مدد کیجئے، ان پر مہربانی کیجئے، زندہ دل بنئے

سچی خوشی لوگوں کی مدد کے سچے جذبے سے حاصل ہوتی ہے۔ خوشی کی مثال خوشبو جیسی ہے۔ دوسروں کو معطر کرنے سے قبل آپ پر فیوم کو اپنے جسم پر چھڑکتے ہیں۔ خود اپنے آپ سے اور پھر ہر زندہ چیز سے مہربانی کا رویہ آپکو بہت بڑی قوت فراہم کرتا ہے۔ اس کے کوئی منفی اثرات نہیں ہوتے۔ یہ چیز بغیر معاوضے کے آپ کو قوت فراہم کرتی ہے۔ رحم خدا کی صفت ہے۔ قرآن پاک کہتا ہے کہ اللہ تعالی جو خود مہربان ہے مہربانی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ بہترین لوگ وہ ہیں جو دوسروں سے اچھا سلوک کرتے ہیں۔ کسی نے بالکل درست کہا ہے کہ خدمت دراصل اس زمین پر رہنے کا معاوضہ ہے۔

فراخ دلانہ اور محبت آمیز برتاؤ آپ کے انداز زندگی کو بدل سکتا ہے۔ جب آپ کسی سے فیاضانہ سلوک کرتے ہیں تو آپ کے جسم میں ایک ایسا کیمیائی مادہ پیدا ہوتا ہے جو آپ کے حواس کو یکسر خوشی سے سرشار کر دیتا ہے۔ کتاب *Heart Break and Heart Disease* کے مصنف سٹیفن سناٹرا کہتے ہیں کہ محبت کا رویہ دل کی بیماریوں کا علاج ہے جبکہ غصہ دل کی بیماری کا سبب بنتا ہے۔ رحم دلی، نرمی اور محبت صرف قلب و ذہن کے لیے ہی نہیں بلکہ جسم کے لیے بھی سکون اور راحت کا ذریعہ بنتے ہیں۔

انسان سے محبت اور ہمدردی کا برتاؤ کرنے والا شخص بہت سی مصیبتوں سے محفوظ رہتا ہے۔ سچائی کا اظہار اپنی جگہ اہم ہے مگر ہمدردی کا اظہار اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ بقول سیموئل جانسن (Samuel Johnson) کسی شخص کی اچھائی کو جانچنے کا درست پیمانہ یہ ہے کہ ایسے شخص کا اس فرد سے سلوک کیسا ہے جو اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ انسان کا جنم محبت ہی سے ہوا ہے۔ یہ جذبہ اسے ہر قسم کے دباؤ اور تفکرات سے آزاد کرتا ہے۔ دوسروں پر مہربانی سے اللہ تعالی کی رضا حاصل ہوتی

ہے۔اس سے بڑی کامیابی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ہم اپنی ذاتی ضروریات پر خوب خرچ کرتے ہیں۔قیمتی ملبوسات، مہنگی خوشبوئیں، فرنیچر، زیورات۔سوال یہ ہے کہ ہم ضرورت مندوں پر کتنا خرچ کرتے ہیں؟ کسی بے کس کی مدد کر کے انسان کو جو خوشی حاصل ہوتی ہے اس کا مقابلہ دنیا کی کوئی نعمت نہیں کر سکتی۔اگر ہم ایک مثبت احساس کے ساتھ زندہ رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں زندگی کی نعمتوں کو دوسروں کے ساتھ بانٹنا ہوگا۔لازم ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں سے دیگر لوگوں کی بھی مدد کریں اور اپنے وسائل کو اعلیٰ مقاصد کے لیے استعمال کریں۔ہم جتنا زیادہ خرچ کریں گے۔اتنا ہی زیادہ اللہ تعالیٰ کا قرب اور اسکی رضا حاصل کریں گے۔

ضرورت سے زیادہ سنجیدگی نہ صرف ماحول کو بوجھل بناتی ہے بلکہ تخلیقیت کو بھی منفی طور پر متاثر کرتی ہے۔حسِ مزاح دوسرے لوگوں کے بارے میں انسان کے رویے کو گوارا بناتی ہے۔یاد رکھیے کہ محض ایک مسکراہٹ پورے ماحول کو جگمگا کر نہ صرف کام کے ماحول کو بلکہ پوری زندگی کو خوشگوار بنانے میں کردار ادا کرتی ہے۔

معاف کرنا سیکھئے

اگر کوئی شخص آپ سے اُلجھتا ہے تو اس کا جواب سختی سے دینا آپ کی طاقت کی بجائے آپ کی کمزوری کو ظاہر کرتا ہے ہمیں ایسے لوگوں کے بارے میں اپنے وقت اور اپنی توانائیوں کو ضائع نہیں کرنا چاہیے بلکہ ایسے معاملات میں خاموشی ہی بہترین جواب ہے۔

جواب جاہلاں باشد خموشی

اس سلسلے میں فرانسس ولرڈ (Frances Willard) کی نصیحت یاد رکھنے کے قابل ہے۔وہ کہتا ہے ''دنیا بہت وسیع ہے۔بہتر ہے کہ ایک ہی جگہ اُلجھنے کی بجائے تیز رفتاری سے آگے بڑھا جائے''۔غصے اور تلخی کا اظہار بہت آسان مگر معاف کر دینا کہیں مشکل ہے کیونکہ اس کے لیے مضبوط ایمان، حوصلہ اور کردار کی پختگی درکار ہے۔لوگ عموماً اپنی غلطی اس لیے تسلیم نہیں کرتے کہ اس پر اِسے دوسروں سے معذرت کرنا پڑتی ہے جو اِس کی اَنا پر گراں گزرتی ہے۔لوگ معاف کرنے کی بجائے لڑائی جھگڑے میں اُلجھ جاتے ہیں یا دوسرے فریق سے تعلقات منقطع کر لیتے ہیں کیونکہ یہ ان کے لیے آسان تر ہے۔

زندگی میں جن لوگوں سے بھی ہمیں واسطہ پڑتا ہے، اتفاق سے نہیں پڑتا۔اس کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی منشا ہوتی ہے۔اور ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو ہمارے لیے دُکھ یا تکلیف کا باعث بنتے ہیں۔خاندانی رشتوں میں بھی سکون کا راز معاف کر دینے میں مضمر ہے۔دوسرے لوگوں کی طرح ہمارے عزیز و اقارب یا خاندان کے افراد بھی ویسا ہی رویہ اختیار کرتے ہیں جس کی تربیت برسوں سے معاشرہ یا ماحول دیتا آیا ہے۔لوگوں کے منفی رویے بھی انسان کی اصلاح کا ذریعہ بنتے ہیں۔دراصل ہمیں اس حقیقت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے ان لوگوں کو ہماری تربیت کا ذریعہ بنایا۔زیرِنظر نظم اسی سوچ کی عکاسی کرتی ہے:

تلاش ہے سکون کی
خُوشی کی ہے طلب تمہیں
خدا کی چاہیے رضا؟
معاف کرنا سیکھ لو!
آرام ڈھونڈتے ہو تم
سکون چاہتے ہو تم

زندگی کی دُھوپ میں
چھاؤں چاہیے تمہیں
تو سارا غصہ تھُوک دو
بھلا دو نفرتیں سبھی
معاف کرنا سیکھ لو!

اگر ہم دوسروں کی غلطیوں سے درگزر کرنا سیکھ لیں تو یہ ہمارے لیے بھی اطمینان کا باعث ہوگا اور دوسروں کے لیے بھی۔ دوسروں کی عزتِ نفس کے نقصان کی تلافی ان کے اعتماد کو بحال کرتی ہے اور نتیجتاً وہ آپ کی عزت کرنے پر خود کو آمادہ کر پاتے ہیں۔

لوگوں کا احترام کیجئے

باہمی عزت واحترام کا ماحول سبھی کے لیے سودمند ہے۔ ممکن ہے کہ جس شخص کو نظر انداز کیا جائے یا اس کی توہین کی جائے، وہ فوری ردعمل ظاہر نہ کرے لیکن حقیقت یہ ہے کہ توہین کا زخم مندمل ہونے میں بہت وقت لیتا ہے۔ اگر آپ خود کو ایسے لوگوں کی جگہ رکھ کر سوچیں گے تو آپ ضرور معاملے کی سنگینی کو محسوس کر سکیں گے۔ عزت واحترام کا حصول ہر انسان کی فطری اور جائز خواہش ہے۔ دوسروں سے توہین آمیز سلوک کرنے والوں کو جب خود ایسے ہی سلوک کا سامنا ہو تو وہ اسے برداشت نہیں کر پاتے۔ لہٰذا دُوسروں کے ساتھ توہین آمیز برتاؤ کرنے کی بجائے نرم دلی کا رویہ اپنانا بہت بہتر ہے۔

وہ لوگ جو دوسروں کو احترام نہیں دیتے، وہ باہمی احترام سے ملنے والی گرمجوشی کی حدت کو محسوس کرنے سے محروم رہتے ہیں۔ جو لوگ بھی ہمارے اردگرد ہیں چاہے وہ ہمارے ہم مرتبہ ہوں، ماتحت ہوں یا کم درجے کے ملازم ہوں، سب کے ساتھ عزت سے پیش آنا چاہیے۔ یہ سوچ درست نہیں کہ عزت صرف اسی کا حق ہے جو اپنی کوشش سے اسے حاصل کرے۔ اس سوچ کے ساتھ آپ باہمی احترام والا ماحول تشکیل نہیں دے سکتے۔ اپنے ماتحتوں سے عزت لینے کے لیے پہلے سینئر کو خود انہیں عزت دینی چاہیے۔ لوگ اپنی عزتِ نفس کے بارے میں بہت حساس ہوتے ہیں اور آپ کا ان کے ساتھ برتاؤ ان کے لیے اہمیت رکھتا ہے۔ ہر انسان کچھ کمزوریوں کے ساتھ دنیا میں آتا ہے۔ لہٰذا ہمیں لوگوں کو ان کی کمزوریوں سمیت قبول کرنا پڑتا ہے۔ یہی معاشرے میں ہم آہنگی اور باہمی احترام کا واحد ذریعہ ہے۔

دوسروں کی تعریف کیجئے

انسان فطرتاً تحسین پسند ہے۔ لہٰذا دُوسروں کی تحسین کرنے میں فیاضی برتئے۔ جائز تعریف اعلیٰ دماغوں کو مزید اونچی پرواز کی جانب مائل کرتی ہے۔ ذی شعور لوگ اس چیز کی اہمیت کو سمجھتے ہیں اِسی لیے وہ ہر مناسب موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لوگوں کو تحسین میں سے ان کا جائز حصہ دیتے ہیں اور یوں ان کا دل بھی جیتتے ہیں اور ان کے ساتھ باہم احترام کا رشتہ بھی استوار کرتے ہیں۔

لوگوں کی تعریف کے لیے اس بات کا انتظار نہ کیجئے کہ وہ کوئی مخصوص اچھا یا بڑا کام کر دکھائیں۔ یہ قطعاً درست نہیں کہ آپ پہلے لوگوں کی خود اعتمادی کو متزلزل کر دیں اور پھر یہ توقع رکھیں کہ وہ بہت اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کریں۔ تعریف کے ذریعے آپ ان کی کارکردگی کو بہتر بنا سکتے ہیں۔ بقول سیموئل جانسن (Samuel Johnson) "دوسروں کی تعریف آپ پر قرض ہے، ہر اس شخص کے لیے جو اس کا مستحق ہے"۔ اس معاملے میں بُخل نہ صرف ناانصافی ہے بلکہ یہ بات ایک شریف آدمی سے بعید از قیاس بھی ہے۔ تعریف ہر قسم کے طنز سے پاک اور مخلصانہ ہونی

چاہیے۔اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ تمام منفی جذبات دب جائیں گے۔ایک سادہ سا اُصول یاد رکھیں "تعریف سب کے سامنے، تنقیص علیحدگی میں" ۔اکثر لوگ اپنی کامیابیوں کا اظہار چاہتے ہیں اور اپنی کمزوریوں کو خود تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔کسی بھی بڑی کامیابی میں ہر شخص کو اس کا حصہ دیا جانا چاہیے۔دوسروں کی کوششوں کو تسلیم کرنا اور ان کو ان کا جائز حصہ دینا شرافت کی دلیل ہے۔اس سلسلے میں محض ایک جملہ یا ایک اشارہ بھی کافی ہوسکتا ہے۔

اپنی انا کو قابو میں رکھیئے

دنیا میں خرابی اور دکھ کا باعث عموماً انسانوں کی انا ہوتی ہے۔اسی سے لالچ ، ہوس اور تکبر پیدا ہوتا ہے۔ان کے مقابلے میں انکساری اور تشکر کے جذبات ہماری صلاحیتوں میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔اپنے آپ کو کامیابی کا محور سمجھنے والے افسوس ناک غلط فہمی کا شکار ہیں۔تمام صلاحیتوں کا ماخذ اللہ تعالی کی ذات ہے۔خود پسندی میں مبتلا افراد تشکر اور امتنان کے احساس سے محروم رہتے ہیں۔

مناسب بات یہ ہے کہ اپنے اندر جھانکا جائے اور درست راستے کے انتخاب کے لیے اللہ تعالی سے مدد مانگی جائے۔انا کے بت کی پُوجا کا مطلب ہی یہ ہے کہ ہم نے خدا کے آگے جُھکنا چھوڑ دیا ہے۔انا ہمیں زندگی کی بہت سی خُوشیوں سے محروم کر دیتی ہے۔اپنے معاشرتی رُتبے اور سٹیٹس کے بارے میں غیر ضروری طور پر حساس لوگ روزمرہ کے کام خود کرنا اپنی ہتک سمجھتے ہیں اور یوں وہ نازک احساسات سے محروم ہو کر انا کے خول میں بند ہو جاتے ہیں۔اپنی صلاحیتوں کو وجہ تفاخر سمجھنے کی بجائے چاہیے کہ ایک نارمل اور احسان مند انسان کی طرح حیرت کا عنصر ہمیں اپنی گرفت میں لے لے۔اِس لمحے قلم ہاتھ میں پکڑے جب میں الفاظ کو کاغذ پر منتقل ہوتے دیکھ رہا ہوں، میں ایک مرعوبیت کے عالم میں ہوں۔ یہ الفاظ کہاں سے نازل ہوتے ہیں! میں اپنے خیالات کو الفاظ کے قالب میں کیونکر منتقل کر پاتا ہوں! اور یہ خیالات ذہن میں کہاں سے آتے ہیں! کیا یہ میں خود ہوں جو یہ سب کچھ لکھ رہا ہوں یا میں محض اپنے آپ کو لکھنے کے عمل میں منہمک دیکھ رہا ہوں! کیا یہ الفاظ میرے بعد بھی باقی رہیں گے؟ میں عجیب حیرت میں گرفتار ہوں۔

ہماری انا ہمیں عموماً اس طرح کے خیالات سُجھاتی ہے

- ☆ چیزوں کا درست ہونا زیادہ اہم ہے نہ کہ انسان کا خوش ہونا۔
- ☆ ہمیں ہر حال میں کامیاب ہونا ہے۔ہار کا مطلب ہے ذہنی دباؤ
- ☆ لوگوں میں ہماری شہرت اور ہماری پوزیشن زیادہ اہم ہے بہ نسبت اس بات کے کہ اپنے خالق کی نظروں میں ہم کیسے ہیں۔
- ☆ کامیابی کا معیار دنیوی اثاثے ہیں نہ کہ خوشی اور اطمینان
- ☆ دوسروں سے برتر ہونا اہم ہے نہ کہ دوسروں پر مہربان ہونا

تکبر کے احساس کو لگام ڈالیے

عظمت تو صرف اللہ ہی کے لیے ہے جو اس کائنات کا خالق بھی ہے اور آقا اور مالک بھی اور ہر لحاظ سے کامل و اکمل بھی۔انسان کے پاس جو کچھ بھی ہے عارضی اور زوال پذیر ہے۔پائدار اور مستقل کچھ بھی نہیں چاہے وہ طاقت ہو، دولت ہو یا مرتبہ۔تاریخ ہمیں انسانوں کی بنائی ہوئی کتنی ہی ایسی تہذیبوں کی تصویر دکھاتی ہے جو صدیوں تک اپنا جھنڈا گاڑے رہیں مگر آخر کار معدوم ہو گئیں اور آج ان کا نشان بھی نہیں ملتا۔مشہور جہاز ٹائی ٹینک (Titanic) جس کے بارے میں دعوی کیا گیا تھا کہ یہ ڈوب نہیں سکتا، اپنے پہلے ہی سفر میں اس طرح غرق ہوا کہ اس پر سوار

1500 افراد لقمہ اجل بن گئے ۔ لہٰذا انسان کو فطرت کی ودیعت کردہ نعمتوں اور صلاحیتوں کے باعث کسی غلط فہمی کا شکار ہو کر تکبر میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی بڑے بڑے دعوے کرنے چاہیں۔ اس لیے کہ اس کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ بھی سدا رہنے والا نہیں ۔ ایسے لوگ جن کو قدرت نے انکسار کے احساس سے نوازا ہے وہ کبھی اپنے علم کے بارے میں غلط فہمی کا شکار نہیں ہوتے اور نہ وہ دوسروں سے سیکھنے میں عار محسوس کرتے ہیں۔ چینی دانشور لاؤسی (Lao Tse) کہتا ہے کہ سیکڑوں دریا اور بلندیوں سے آنے والے متلاطم ندی نالے اپنے آپ کو سمندر میں گم کر دیتے ہیں کیونکہ سمندر اپنے آپ کو نشیب کا پابند رکھتا ہے۔ اپنے آپ کو اہم سمجھنے والے افراد چاہے بلند دنیوی مناصب بھی حاصل کر لیں ، انہیں سچی عزت کبھی حاصل نہیں ہوتی۔ ایسے لوگ ٹھہراؤ اور توازن سے محروم ہوتے ہیں ۔ غرور دھیرے دھیرے انسانیت کے جوہر کو ہڑپ کر جاتا ہے ۔ تکبر روحانی تسکین کا سب سے بڑا دشمن ہے ۔ اسے قابو میں رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ دل میں خوفِ خدا کی پرورش کی جائے ، بڑے بڑے تیس مار خانوں کے زوال سے سبق سیکھا جائے ، دوسروں کے مسائل کو سمجھنے کے لیے اپنے آپ کو ان کی جگہ پر رکھ کر دیکھا جائے ، تحمل کی عادت ڈالی جائے اور روزمرہ کے چھوٹے موٹے کام خود کرنے کو ترجیح دی جائے ۔ چینی مفکر تاؤتی چنگ (Tao Te Ching) کا یہ مشورہ قابلِ توجہ ہے:

عاجزی سے کام لو
تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا
دانا شخص کبھی اپنی نمائش نہیں کرتا
لہٰذا شہرت کے آسمان پر آفتاب بن کر چمکتا ہے
وہ اپنی ستائش نہیں کرتا
لہٰذا سب اس کی تعریف کرتے ہیں
وہ اپنی رائے کو خود درست نہیں کہتا
دوسرے ایسا کرتے ہیں
وہ خود کو بہترین نہیں سمجھتا
چنانچہ سب سے آگے رہتا ہے

حسد سے بچئے

حسد کوئی فائدہ نہیں دیتا بلکہ اس کا نقصان حسد کرنے والا ہی اٹھاتا ہے اور اپنی زندگی میں زہر گھول لیتا ہے ۔ حسد آپ کو بھلائی کرنے کی صلاحیت سے محروم کر دیتا ہے ۔ حسد کرنے والا اپنی زندگی کو کربناک بنا لیتا ہے کیونکہ وہ دوسروں کی خوشیوں میں خوش نہیں رہتا بلکہ خود کو محروم محسوس کرتا ہے ۔ کسی دوست کا قرعہ اندازی میں نکلنے والا انعام، کسی رشتے دار کا بڑا گھر ، یا کسی ساتھی کے بچوں کی امتحان میں اچھی کارکردگی ایسے شخص کی راتوں کی نیند چھین لیتی ہے۔

لالچ سے دُور رہیے

لالچ جیسا بے رحم آقا کوئی نہیں ۔ یہ انسان کی روح اور اس کی اخلاقیات کو ختم کر دیتا ہے ۔ ہوس بڑھتے بڑھتے ایک جنون اور ایک نہ ختم ہونے والی پیاس کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

لالچ اور بخل سچی خوشی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں ۔ اپنی دولت اور خوش قسمتی میں دوسروں کو شریک کرنے ہی سے حقیقی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ لالچ انسانوں کو ایک دوسرے سے لاتعلق بنا دیتا ہے یہاں تک کہ اپنی غرض کے لیے وہ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے سے بھی دریغ

نہیں کرتے۔ جب اپنا اُلّو سیدھا کرنا ہی مقصد بن جائے تو انسانیت اپنی پہچان کھو دیتی ہے۔ بے لگام لالچ انسان کو پھانسی کے تختے تک نہ بھی لے جائے تو اس کی زندگی میں دُکھ اور افسوس کی آمیزش ضرور کر دیتا ہے۔ ایسے لوگ جتنا زیادہ حاصل کرتے ہیں، ان کا احساس محرومی اسی نسبت سے بڑھ جاتا ہے۔ بہت سی سماجی اور اخلاقی کمزوریوں کی جڑ یہی لالچ ہے۔ یہی ہمیں دوسروں کی مدد اور تعاون سے روکنے کی ترغیب دیتا ہے۔ یہی ہمیں دوسروں کی قیمت پر اپنے نمبر بنانے پر اُکساتا ہے لیکن ایسا کر کے ہم نہ اپنے لیے عزت حاصل کر سکتے ہیں اور نہ قوم اور معاشرے کی خدمت کر سکتے ہیں۔ قرآن پاک کے ان الفاظ میں کتنی حکمت ہے کہ وہ لوگ جو نفس کے لالچ پر قابو پا گئے، اصل میں وہی کامیاب ہیں۔

خاموشی کی اہمیت کو سمجھئے

اگر خدا کی انسان سے یہ منشا ہوتی کہ وہ زیادہ بولے اور کم سنے تو یقیناً وہ ہمیں دو منہ اور ایک کان عطا کرتا۔ خاموشی اور تفکر ذہنی دباؤ اور ڈپریشن کا بہترین علاج ہیں۔ یہ رُوح کی صفائی اور اپنے خالق سے ہمارے رابطے کا ذریعہ ہے۔ خالق کائنات یہ چاہتا ہے کہ انسان بہتر سے بہترین بنتا چلا جائے۔ وہ خود ہماری اپنی ذات کی دریافت میں ہماری مدد کرتا ہے۔

خاموشی اور تنہائی کا حصول اگرچہ آسان نہیں مگر ضروری ہے۔ اس کے لیے بہتر یہ ہے کہ دن کا آغاز عبادت، مطالعے، غور و فکر یا ورزش سے کیا جائے۔ میں ایک ایسے بڑے افسر کو جانتا ہوں جو اپنے ماتحتوں کو صبح ساڑھے آٹھ سے نو بجے کے درمیان ٹیلیفون کرنے یا ملاقات کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ ان کے لیے خاموشی کا وقت ہوتا ہے۔

ایسے کئی لوگ جو طویل بیماری کا شکار رہے وہ خاموشی اور تفکر کے ذریعے اس سے نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ خاموش رہ کر سوچنے اور ہر اچھائی سے اپنا رابطہ استوار کرنے کی کوشش کیجئے۔ میں پہلے سفر کے دوران لوگوں سے باتیں کر لیا کرتا تھا۔ اب میں اس وقت کو سوچنے، پڑھنے، لکھنے میں صرف کرتا ہوں۔ یوں میں نے محسوس کیا ہے کہ ایک طویل سفر کے بعد تخلیقیت کا وفور بڑھ جاتا ہے۔

اپنے قول و عمل میں مطابقت پیدا کیجئے

عمل الفاظ سے زیادہ اثر رکھتا ہے۔ آپ کتنی بھی تبلیغ اور وعظ کر لیں، آپ کا عمل جب تک آپ کے الفاظ کا ساتھ نہ دے، تبلیغ بے سود رہے گی۔ جب گفتار و کردار میں فرق دُور ہوگا تب ہی لوگ آپ پر اعتماد کریں گے۔ لہٰذا آپ جو کہیں، اس پر عمل کریں۔ قول و فعل میں تضاد رکھنے والے لوگ کبھی اس سکون سے آشنا نہیں ہوتے جو ایک سچی، ایماندارانہ زندگی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اپنی اقدار پر بھروسہ کیجئے اور ان پر عمل کیجئے۔ مقاصد اور اقدار میں فرق ہوتا ہے۔ مقاصد تبدیل ہو سکتے ہیں جبکہ اقدار چٹان کی مانند اٹل ہوتی ہیں۔ قول و عمل میں ہم آہنگی لوگوں کے درمیان اعتماد کا رشتہ اُستوار کرتی ہے۔ اعتماد بحال رہے تو چھوٹی موٹی غلطیاں نظر انداز کر دی جاتی ہیں۔ اس اعتماد کی موجودگی میں آپ بڑی آسانی کے ساتھ لوگوں سے دل کی بات کہہ سکتے ہیں۔

اپنا ضمیر صاف رکھیے

احساس جرم انسان کی روح کے لیے اذیت کا باعث ہوتا ہے۔ غلط کام کرنا اور پھر اس کو درست ثابت کرنے کی کوشش کرنا قطعی طور پر غیر اخلاقی ہے۔ ہمیں خود کو ویسا ہی تسلیم کرنا اور دوسروں کے سامنے ویسا ہی ظاہر کرنا چاہیے جیسے کہ حقیقت میں ہم ہیں۔ ڈیل ومبرو (Dale Wimbrow) اپنی نظم میں اسی چیز کو موضوع بناتا ہے:

تم ساری زندگی
ساری دنیا کو بے وقوف بنا سکتے ہو
اور شاباش حاصل کر سکتے ہو
مگر اس دھوکے اور چالاکی کا حتمی نتیجہ
اس کے سوا کچھ نہیں کہ
آنسو تمہارا مقدر بنیں

اپنے ضمیر کو ہر بوجھ سے آزاد رکھنے کے لیے لازم ہے کہ انسان سچا اور ایماندار رہے، اپنے سامنے بھی اور دوسروں کے سامنے بھی۔ اگر آپ اندر اور باہر سے ایک ہوں تو آپ کے خوف اور پریشانیاں نہ ہونے کے برابر ہوتی ہیں۔ جان وارڈن (John Warden) نے کیا پتے کی بات کہی ہے " کوئی تکیہ اتنا نرم اور آرام دہ نہیں ہوسکتا جتنا ایک صاف ضمیر"۔ آج کے مقابلے کے دور میں اعلیٰ مرتبوں پر فائز افراد بسا اوقات اخلاقی حدود سے صرفِ نظر کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ طریقہ انہیں کامیابی دلا سکتا ہے۔ مگر کردار کی یہ کمزوری انہیں عزت سے محروم کر دیتی ہے اور اس کے بعد اعتماد کی بحالی بہت مشکل ہو جاتی ہے۔ دوسری جانب صاف ضمیر لوگ دوسروں کے لیے بھی آسانی فراہم کرتے ہیں اور خود بھی آرام کی نیند سوتے ہیں۔

اپنے رّب کو یاد رکھیئے

جب سب سہارے ٹوٹ جائیں تو اللہ کی یاد سب سے بڑا اور یقینی سہارا ثابت ہوتی ہے۔ کسی نے درست کہا ہے کہ اللہ کو نہ ماننے والے اس ان دیکھے سہارے سے محروم رہتے ہیں۔ مایوسی کے اندھیروں میں وہی سب سے بڑا سہارا ہے۔ وہ جو سب سے زیادہ طاقت ور بھی ہے اور سب سے زیادہ مہربان بھی۔ قرآن پاک کہتا ہے ''بے شک دلوں کا سکون اللہ کی یاد میں ہے''۔ اس کو یاد کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی بے پایاں نعمتوں کا احساس دل میں پیدا کیا جائے اور انسان کی رُوح اس کے شکر کے احساس میں ڈوبی رہے۔ اس کی یاد ہو تو دل میں اس کا خوف بھی بیدار رہتا ہے جو انسان کو سیدھے راستے پر رہنے میں مدد دیتا ہے۔ اللہ کا خوف اور اس کی رحمت کی امید ہی وہ راستہ ہے جو انسان کو بھٹکنے سے بچاتا ہے' یہی وہ چیز ہے جو انسان کی روح کو گناہ، لالچ، حسد اور تکبر سے پاک کرتی ہے۔ اور جب روح صاف ہو جائے تو انسان کا دل خوشی، سکون اور مثبت خیالات کی مستقل آماجگاہ بن جاتا ہے۔

آخری بات

اگرچہ مادیت کی اندھی دوڑ اور اس کے نتیجے میں اخلاقی قدروں کے زوال کو روکنا ہمارے بس میں نہیں ہے، مگر انفرادی اور اجتماعی طور پر ہمیں اپنے آپ کو درست کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہمیں چاہیے کہ اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھیں اور زندگی کے مشکل لمحوں میں باوقار رویہ اختیار کریں۔ خوشی دراصل ایک رویے کا نام ہے جو آپ موسیقی سنتے ہوئے اپنی الماری میں کپڑے یا اپنی کتابیں درست کرتے ہوئے بھی حاصل کر سکتے ہیں اور دوستوں کی محفل سے بھی۔ ہم میں سے ہر ایک سچی خوشی کا طلبگار ہے۔ لہٰذا جب خوشی اپنے تمام تر رنگوں سمیت ظاہر ہو تو ہمیں اس کے حصول میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ خوشی مستقبل کے سہانے خوابوں میں نہیں بلکہ لمحہ موجود میں تلاش کریں۔ ایک مفکر کے بقول خوشی حالات کی کسی خاص صُورت یا کسی خصوصی منزل کا نام نہیں بلکہ اس منزل تک سفر اور سفر کے انداز کا نام ہے۔ خوشی کے حُصول کا ایک یقینی ذریعہ ہے مثبت رویہ اپنانا، دل میں شکر کا احساس جگانا اور دوسروں سے بھلائی کرنا۔ سو باتوں کی ایک بات یہ کہ اللہ پر ایمان انسان کے لیے خوشی، انبساط اور اطمینان کا دوسرا نام ہے۔

ڈاکٹر محمد حنیف (ایم سی ایس)

پاکستانی تاریخ کے دوسولہ دسمبر

وطنِ عزیز برصغیر کے کروڑوں مسلمانوں کی سیاسی' سماجی' انفرادی واجتماعی قربانیوں کے بعد 14 اگست 1947ء کو دنیا کے نقشے پر اُبھرا۔ چونکہ پاکستان کا قیام برصغیر میں مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل تھا لہٰذا یہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی دو اِکائیوں کی صورت میں بنا جن کے درمیان کوئی زمینی راستہ نہیں تھا اور بھارت کا ہزاروں میل کا رقبہ اس میں حائل تھا۔

ہندوستان نے شروع دن سے ہی برصغیر کی تقسیم اور اس کے نتیجے میں بننے والی مسلم ریاست' پاکستان کو دل سے قبول نہیں کیا تھا' لہٰذا پاکستان کے قیام کے فوراً بعد ہندوستان نے ہر طرح سے کوشش کی کہ پاکستان کے وجود کو جس قدر جلد ہو سکے ختم کیا جائے یا پھر مشرقی پاکستان کے مضبوط بازو کو ہی کاٹ دیا جائے۔

بھارت اپنی ریشہ دوانیوں میں کامیاب ہوا اور 16 دسمبر 1971ء کو ''سقوطِ ڈھاکہ'' پیش آیا اور مشرقی پاکستان دنیا کے نقشے پر بنگلہ دیش کے نام سے خودمختار اسلامی مملکت کے طور پر وجود میں آیا اور مغربی پاکستان' اسلامی جمہوریہ پاکستان کے نام سے دنیا کے نقشے پر موجود رہا۔ اس طرح 1971ء کا 16 دسمبر تاریخِ برصغیر پر گہرے نقوش اور دکھ بھری داستان چھوڑ گیا۔

نائن الیون کے واقعہ کے بعد پاکستان کے دشمنوں کو ایک بار پھر موقع ہاتھ آیا لہٰذا دہشت گردی کی آگ کے شعلے افغانستان سے نکل کر پاکستان کے طول وعرض میں پھیل گئے اور پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ گزشتہ ایک عشرے سے پاکستان دہشت گردی کے خلاف تنہا برسرِ پیکار ہے۔ پاکستان کے وہ دشمن جنہوں نے ''مکتی باہنی'' تحریک چلا کر مشرقی پاکستان کو متحدہ پاکستان سے جدا کیا تھا وہ اب بلوچستان میں علیحدگی پسند بلوچستان لبریشن فرنٹ کی صورت میں سندھ (خصوصاً کراچی میں) ٹارگٹ کلرز کی صورت میں پنجاب اور خیبر پختونخواہ میں منظّم دہشت گردوں کی پشت پناہی کی صورت میں کارفرما ہیں۔ 16 دسمبر 2014ء کو آٹھ دہشت گردوں نے آرمی پبلک سکول پشاور پر حملہ کر کے خون کی ہولی کھیلی' جس کے نتیجے میں 134 معصوم بچوں' سکول کی پرنسپل' اساتذہ اور سٹاف کے سمیت 143 لوگوں نے جامِ شہادت نوش کیا اور اس طرح ظلم وبربریت کی ایک تاریخ رقم ہوئی۔

ایک زخمی طالب علم نے چند ہفتوں بعد شہادت پائی' اور ابھی تک کئی شدید زخمی طلباء زیرِ علاج ہیں' ان میں سے ایک کو علاج کے لئے برطانیہ منتقل کیا گیا ہے۔

اس طرح دوسولہ دسمبر (1971 اور 2014) پاکستان کی تاریخ میں دکھوں اور غموں کے ملے جلے جذبات کے ساتھ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے وجود کو تا قیامت

سلامت رکھے اور اس کے دشمنوں کو ہر میدان میں نیست و نابود کرے۔ پاکستان آرمی اس دہشت گردی کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند ''ضربِ عضب'' کی صورت میں نبرد آزما ہے جس کی کامیابی کے لیے پاکستان کا ہر شہری دل سے دعا گو ہے۔ ان شاءاللہ وہ وقت دور نہیں جب پاکستان کے محبِّ وطن شہری ''ضربِ عضب'' کی کامیابی کے بعد پاکستان کو دہشت گردی کی لعنت سے پاک ملک کی صورت میں دیکھیں گے۔ وطنِ عزیز پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے اور ان شاء اللہ تا قیامت سلامت رہے گا۔ سبز ہلالی پرچم پوری دنیا کے ملکوں میں مقام برقرار رکھے گا اور پاکستانی ہر جگہ عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے رہیں گے۔

عماد الدین (ایم سی ایس)

اقبال کا فلسفۂ خودی

شاخوں کے کاٹنے سے قلم بنتے ہیں، پتھر کو تراشا جائے تو صنم خانے سجتے ہیں، دانہ دھوپ کی تپش سہتا ہے تو گل و گلزار بنتا ہے۔ اِسی طرح جب انسان خود کو تراشتا اور سنوارتا جاتا ہے تو اس کرۂ ارض پر اشرف المخلوقات کہلاتا ہے۔ خود کو تراشنا اور اپنی ہی ذات کی آگاہی حاصل کرنے کا نام خودی ہے۔ خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں۔ انسان جس قدر اِس پر غور و فکر کرتا ہے، اُسی قدر اُس کے سامنے راز کھلتے جاتے ہیں۔ خودی عرفانِ ذات کا نام ہے۔ خودی اپنی ہی صلاحیتوں کی پہچان کا نام ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

خودی کیا ہے؟ رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے؟ بیداریٔ کائنات

انسان جب اپنی صلاحیتوں کو پہچان لے تو یہ زندگی بھی اُس کے لئے گُل و گلزار ہے۔ خودی کو پانا جس قدر سہل لگتا ہے، یہ اُسی قدر کٹھن بھی ہے۔ خودی کا راستہ گلزاروں سے نہیں خارزاروں سے ہو کر گزرتا ہے۔ انسان کی عظمت خودی کو پانے کی خاطر مکّے کی گلیوں میں لہولہان ہوتی ہے۔ عظمت خودی کو چھونے کے لیے پتھراؤ کا سامنا بھی کرتی ہے۔ زندگی کی تمام مشکلات خودی کے رستے میں آتی ہیں لیکن خود کو پانے والے اِن تمام مصائب کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں اور باطل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُس کی روح میں اُتر جاتے ہیں کیونکہ وہ خودی کے مقام سے آشنا ہیں۔ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ فرماتے ہیں:

تری زندگی اسی سے، تری آبرو اِسی سے
جو رہی خودی تو شاہی، نہ رہی تو رُوسیاہی

یہ خودی ہی تھی جس نے تمام اہم شخصیات کو مورّخ کے قلم میں اُتار دیا۔

جب انسان اپنے نفس کو جانچتا' اپنی صلاحیتوں پر غور وفکر کرتا' اورانہیں بروئے کار لاتا ہے تو یہی ہے مقامِ خودی۔علامہ اقبالؒ بھی اپنی قوم میں وہ بیداری چاہتے تھے کہ اُن کی قوم بیدار ہو اور خود کو پہچان پائے' اُن کی قوم ترقی اور سربُلندی کی حد پار کرے' وہ چاہتے تھے کہ اِس قوم کے جوان غیور اور بیدار ہوں۔انسان کی قیمت مال ومتاع سے نہیں بلکہ اس کی صلاحیتوں سے ہوتی ہے۔جذبات پر روشنی ڈالنے کے لئے علامہ اقبالؒ نے خودی کا لفظ استعمال کیا۔خودی خودشناسی کا نام ہے' خودی نام ہے عرفانِ ذات کا اور اگر یہ خودی بیدار نہ ہو تو زندگی کی حقیقت رائیگاں جاتی ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ جب تک یہ خودی بیدار رہی تب تلک عروج قوموں کا مقدر بنتا رہا۔اور جب خودی کا جذبہ کاہلی اور ناخودشناسی میں بدلا تو زوال نے اُن کو گھروں کی باندی بنا دیا۔گلستانِ بنگال نذرِ خزاں ہو گیا' دُکن ویران ہوا' کہ بات مال ومتاع کی نہیں' یہ بات جاہ وجلال کی نہیں بلکہ یہ بات خودی کی موت کی ہے۔رنگوں سے بہار نکلی اور دُنیا پھیکی ہوتی گئی کہ یہ خودی کی موت تھی۔علامہ اقبالؒ مسلمانوں کو اِسی غفلت اور موت سے نکالنا چاہتے تھے اور بیداری کا پیغام دیتے تھے' وہ ہمیں جینے کے قرینے سکھا گئے کہ جیو تو یوں کہ زندگی بھی رشک کرے۔

ارسلان ارشد (ایم سی ایس)

شاندار دلیل

یہ پاکستان بننے سے پہلے کی بات ہے۔انگریزوں نے حکم صادر کیا کہ 6 بجے کے بعد کوئی دکان کھلی نہیں رہے گی۔ایک دکاندار کی گھڑی دس منٹ پیچھے تھی۔جب 6 بج چکے تو پولیس نے دیکھا کہ اس کی دکان ابھی بھی کھلی ہے' وہ اسے پکڑ کر لے گئی۔وہ شخص چلّاتا رہا اور انہیں اپنی گھڑی پر وقت دکھاتا رہا مگر پولیس نے اس کی ایک نہ سنی' اسے عدالت میں پیش کر دیا۔اس شخص کے گھر والوں نے ایک دیانتدار وکیل کی خدمات حاصل کیں۔وہ وکیل پُروقار انداز میں کورٹ میں داخل ہوا۔اس شخص کا جرم بتایا گیا۔وکیل نے جج کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے دلائل دیئے۔

جج نے وکیل سے پوچھا ''آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ شخص بے قصور ہے۔'' اس پر وکیل نے وہاں موجود چند لوگوں سے گھڑیاں لیں اور جج کے سامنے رکھ دیں اور جج سے سوال کیا۔''جناب! کیا ان گھڑیوں میں سے دو گھڑیوں کا وقت ایک جیسا ہے؟''

''نہیں'' جج نے جواب دیا۔

وکیل نے کہا ''اسی طرح کا واقعہ میرے موکل کے ساتھ ہوا' اس کی گھڑی بھی دس منٹ پیچھے تھی۔چنانچہ میرا موکل بے قصور ہے لہٰذا اسے بری کیا جائے۔'' انگریز وکیل کی ذہانت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اس نے فوراً اس شخص کو بری کر دیا۔

یہ وکیل ہمارے پیارے قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ تھے۔

ارسلان ارشد (ایم سی ایس)

مجھے کچھ نہیں آتا

سب سے پہلے تو یہ سوچیں گے کہ میرے مضمون کا عنوان عجیب ہے۔ ایسے جیسے کوئی مکان تعمیر کرے اور اس کا کوئی دروازہ نہ رکھے مگر مجھے یقین ہے کہ ہر وہ شخص جو کسی بھی مجلس میں بڑے فخر سے کہتا ہے کہ مجھے کچھ نہیں آتا' وہ یہ کہنا چھوڑ دے گا۔ بلکہ زمانے بھر کے سوالوں کے جواب اس کے ذہن میں مچل اٹھیں گے۔ موضوع کے مطابق ایک حدیث پاکؐ سے آغاز کر رہا ہوں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''مہد سے لحد تک علم حاصل کرو''۔

سوچیں مہد جھولے کو کہتے ہیں۔ جھولے میں پڑا معصوم نومولود بچہ بھلا کیا علم حاصل کرے گا۔ اگر آپ یہ کہیں کہ نومولود علم حاصل نہیں کر سکتا تو پھر بحیثیت مسلمان ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ اگر ایسا ممکن نہیں تھا تو اس بارے میں ارشاد کیوں فرمایا گیا؟ ذرا غور کیجئے' معصوم بچے کو اگر آپ اب ت۔۔۔ پڑھائیں گے تو وہ یقیناً جواب نہیں دے سکے گا۔ مگر اپنی ماں کی گود کو وہ خوب پہچانتا ہے تو کیا یہ علم نہیں؟ اگر وہی بچہ کسی وجہ سے بلبلا اٹھے تو سارے عالم کی مائیں اس روتے بچے کو اپنی گود میں لے لیں' اپنے سینے سے لگا لیں مگر وہ بچہ اطمینان نہیں پاتا۔ اسی اثنا میں اس کی ماں میلے لباس کے ساتھ سامنے آئے' تو بچہ اس کی گود میں جا کر سکون و اطمینان محسوس کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چند ماہ کا بچہ یقیناً کھڑا بھی نہیں ہو سکتا۔ خود کھا بھی نہیں سکتا' پی بھی نہیں سکتا' چل پھر بھی نہیں سکتا' بات سنتا ہے لیکن جواب نہیں دے سکتا۔ یہ تمام نشانیاں اس کے وجود میں واضح ہیں' مگر حیرت ہے کہ وہ نادان بچہ اپنی ماں کی کیسے پہچان رکھتا ہے؟

پھر یکا یک ماں کی ممتا جب اس کے ننھے وجود پر برسات کی طرح برستی ہے تو وہ مسکرا کر ماں کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ کیا یہ علم نہیں ہے؟ اگر آپ کو یہ بات سمجھ آ گئی ہو تو بزم تصورات سجائیے اور محسوس کیجئے کہ غیب سے صدا آ رہی ہے۔ ہم نے تمہیں چند ماہ کی عمر میں تمہارے ظرف کے مطابق نواز دیا تھا اور تم اس وقت بھی یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ ''مجھے کچھ نہیں آتا''

واضح رہے کہ مندرجہ بالا تحریر میں بچے کے علم کو بزم احساس تک پہنچایا گیا وہ بچہ آنے والے وقت کا قائداعظمؒ یا اقبالؒ تو نہیں بلکہ ایک عام فرد ہے تو پھر سوچئے وہ لوگ جو بڑے ہو کر قوموں میں انقلاب برپا کرتے ہیں' وہ جب اپنا ننھا وجود لئے جھولے میں جھول رہے ہوں گے تو ان کے علم کا اندازہ کرنا ناممکن ہو گا تبھی تو علامہ اقبالؒ نے حضرت ابراہیمؑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیلؑ کو آدابِ فرزندی

زمین و آسمان کے درمیان اشرف المخلوقات بہر حال ایک اعلیٰ مقام پر فائز ہے۔ آدم خاکی تو جب اس دنیا میں پہلی سانس لیتا ہے' اسی وقت اللہ تعالیٰ اس کے سینے میں تخت و تاج سے زیادہ قیمتی خزانے رکھ دیتا ہے جس کے بارے میں علامہ اقبالؒ کہتے ہیں:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا' نہ بن اپنا تو بن

احمد عبداللہ (ایم سی ایس)

اقبالؒ کا تصورِ خودی

خودی کا سرِ نہاں لا الہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الہ الا اللہ

یہ دور اپنے براہیمؑ کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الہ الا اللہ

اللہ رب العزت نے انسان کو اس دنیا میں اپنا نائب بنا کر بھیجا ہے' اللہ نے خودی کو ستر ہزار پردوں میں پنہاں کر رکھا ہے۔ اِس کائنات میں وہ اپنی نشانیوں کے ساتھ عیاں ہے۔ چرند' پرند' حیوانات و نباتات اسی کے احکام کے تابع ہیں کہیں طلوع و غروبِ آفتاب اُس کی ذات کا پتا دیتے ہیں تو کہیں مہکتے پھول اور چہچہاتے پرندے محوِ تسبیح و تقدیسِ الٰہی نظر آتے ہیں۔ انسان کو اشرف المخلوقات بنایا گیا ہے۔ سوچ سمجھ اور ہوش و خرد کی نعمتوں سے سرفراز کیا گیا ہے۔ اِس کی تخلیق کے وقت معصوم ملائکہ نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کی کہ انسان زمین میں فساد پھیلائیں گے' کیا ہم اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کے لیے کم ہیں؟ مگر اللہ نے فرمایا کہ تم نہیں جانتے جو میں جانتا ہوں۔ پس انسان خلافت کے منصب جلیلہ کے ساتھ اِس دنیا میں جلوہ فگن ہوا۔ یہاں آنے کا مقصد اِس دنیا کی رنگینیوں میں کھو جانے اور اپنے خالق کو بھول جانے سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ اپنے رب تک رسائی اُس کی یاد میں محورہ کر' عبادات کا دامن تھام کر اور اِس سے بھی بڑھ کر اللہ کی مخلوق سے محبت کر کے حاصل کی جا سکتی ہے۔ اپنے رب تک رسائی کا سفر خودی کہلاتا ہے۔ اِسی سفر کی کٹھن گھاٹیوں سے گزر کر انسان جو مقام پاتا ہے' آدمیت کی معراج کہلاتا ہے اور حقیقتاً انسان نائب خداوندی کہلانے کا مستحق قرار پاتا ہے۔

علامہ محمد اقبالؒ بلاشبہ عندلیب باغ مجاز ہیں' آپؒ سے قبل خودی کو ذاتی انا' غرور اور تکبر کے معنوں میں لیا جاتا تھا مگر اِس کے اصل اسرار و رموز سے دنیا اقبالؒ کے افکار کے بعد واقف ہوئی۔ اُردو ادب کے معروف و تابناک ستارے پروفیسر یوسف سلیم چشتی و دیگر خودی کے تین مراحل کا تذکرہ کرتے ہیں:

1۔ اطاعتِ الٰہی
2۔ ضبطِ نفس
3۔ عرفانِ ذات

کہا جاتا ہے: مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ اللّٰه یعنی جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اُس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔

جہاں دانش ور کو اِس دنیا سے الگ تھلگ رہ کر ڈھونڈتے ہیں وہاں اقبالؒ اِن خیالات کے حامی نظر آتے ہیں:

جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں' زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں

حقیقت اپنی آنکھوں پر نمایاں جب ہُوئی اپنی
مکاں نکلا ہمارے خانۂ دل کے مکینوں میں

''وَنَحنُ اَقرَبُ اِلَیہِ مَنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ'' یعنی ''ہم انسان سے اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں'' یہ بھی اس حقیقت کی غماز ہے۔ وہ شخص جو اِس دُنیا میں آ کر بھی اِس کی چکا چوند سے محفوظ رہتا ہے' اپنے دامن کو داغدار ہونے سے بچاتا رہتا ہے' اپنے رب کے بتائے ہوئے قواعد وضوابط کی پاسداری کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا' شریعت پر عمل پیرا رہتا ہے۔

''یَآ اَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْ ادْخُلُو فِیْ السَّلْمِ کَافَتۃً'' کے مصداق دینِ مبین میں پوری طرح داخل ہو جاتا ہے پھر وہ جہادِ اکبر یعنی اپنے نفس کے خلاف جہاد کرتا ہے' اس کا محاسبہ کرنے کی کٹھن ترین منزل سے گزرتا ہے کسی مردِ کامل کا ہاتھ پکڑتا ہے' ذکر وفکر کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے۔ مجازی فقر کے مدارج طے کرتا ہے' اپنی ترجیحات اپنے رب کے احکامات کے تابع لے آتا ہے' اپنی رضا اپنے مالک کی رضا میں گم کر دیتا ہے پھر کہیں جا کر اُسے اُس کی اِس تگ ودو کا ثمر ملتا ہے' وہ روحانیت کی دنیا کا بادشاہ بن جاتا ہے' وہ نورِ معرفت حاصل کرنا شروع ہو جاتا ہے' ایام کا راکب بن جاتا ہے' پھر اُس کی اذاں ندائے آفاق بن جاتی ہے' اُس کی ہاں اور زبان میں دنیا کے فیصلے ہوتے ہیں' اُس کی زبان تاریخ کی حُجّت بن جاتی ہے پھر وہ ستاروں پر کمندیں ڈالنے لگتا ہے' اُس کی تدبیر اُس کی تقدیر بن جاتی ہے اور خدا بندے سے خود پوچھتا ہے بتا تیری رضا کیا ہے۔ پھر اُس کے لیے سورج بھی واپس پلٹتا ہے اور چاند بھی دو ٹکڑے ہو جاتا ہے' اُس کے ہاتھ میں موجود کنکریاں بھی کلمہ طیبہ کا ورد شروع کر دیتی ہیں اور خونخوار درندے بھی تابعداری کو اپنی سعادت سمجھتے ہیں۔ یہی وہ وقت ہوتا ہے کہ جب اللہ انسان کا ہاتھ بن جاتا ہے' اُس کا کان

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہرِ یک دانہ\
یک رنگی و آزادی اے ہمتِ مردانہ!

یا سنجر و طغرل کا آئینِ جہانگیری\
یا مردِ قلندر کے اندازِ ملوکانہ!

یا حیرتِ فارابیؒ یا تاب و تبِ رومی\
یا فکرِ حکیمانہ' یا جذبِ کلیمانہ

یا عقل کی روباہی' یا عشقِ یدُ اللّہی\
یا حیلۂ افرنگی' یا حملۂ ترکانہ!

یا شرعِ مسلمانی' یا دَیر کی دربانی\
یا نعرۂ مستانہ' کعبہ ہو کہ بت خانہ

امیری میں' فقیری میں' شاہی میں' غلامی میں\
کچھ کام نہیں بنتا بے جرأتِ رِندانہ

—— علامہ اقبالؒ

بن جاتا ہے' اُس کے پاؤں بن جاتا ہے اور وہ انسان پھر اپنے رب کے ذریعے اِس دنیائے فانی میں تصرف کرتا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے' یہ کائنات اس پر اپنے راز منکشف کرتی ہے' اُس کی آنکھوں کے سامنے حائل پردے بے وُقعت ہو جاتے ہیں' پھر اُس کا رابطہ اپنے رب سے بلا واسطہ ہو جاتا ہے۔ اِسی کیفیت کو بذبانِ اقبالؒ یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

خودی کی جلوتوں میں مُصطفائی\
خودی کی خلوتوں میں کبریائی\
زمین و آسمان و کرسی و عرش\
خودی کی زد میں ہے ساری خُدائی

امینہ فلک شیر

ردائے بے ثمر

بس اس کی دیوانی ہو کر کے
چھم نیر بہائے نین گوائے
جب پوچھا کسو نے کون ہے یہ
تب اس نے کہا یہ عورت ہے

عورت ہی تو ہے جو اجر و جزا کا تقاضا کیے بغیر ایک اوڑھنی کی طرح درد اور اذیتیں اپنے اندر سموئے جاتی ہے ۔ بے شک یہ مشرقی معاشرے میں عورت ماں' بہن' بیوی اور بیٹی کے رشتوں سے موسوم کی جاتی ہے مگر معاشرے میں بلند مقام ماں اور بہن کو ہی حاصل ہو پاتا ہے مگر جیسے ہی عورت بیوی کے رشتے سے منسوب ہوتی ہے تو پھر جیسے اس کی کایا ہی پلٹ جاتی ہے۔ازدواجی زندگی کا آغاز چند ماہ تو کسی دیو مالائی داستان کی مہارانی کی طرح گزر جاتے ہیں پھر وہی '' چار دن کی چاندنی' پھر اندھیری رات'' کے مترادف یک لخت ظلم و ستم اور سرد جنگ کا طویل دور جنم لیتا ہے۔ جانِ من دشمنِ جاں دکھائی دینا شروع ہو جاتی ہے اور صبر کی دیوی کا سر مظالم توڑنے کا مقام قرار پاتا ہے۔کہیں چولہوں کے پھٹنے تو کہیں گیس کے اخراج سے بہوئیں جلتی بُھنتی دکھائی دیتی ہیں' کہیں بدچلنی کے الزام پر سرمنڈوا دیئے جاتے ہیں تو کہیں سنگسار کروا دی جاتی ہیں۔کہیں ننگے سر گلیوں میں گھسیٹا جاتا ہے تو کہیں چوک میں لے جا کر سُسر کے ہاتھوں ٹکڑے کروا دیئے جاتے ہیں۔عورت کو چارے کی طرح کاٹا جاتا ہے۔نفع بھی دیتی ہے اور جان بھی گنواتی ہے' عورت لاکھ آزاد ہو جائے مگر غیر مرئی حصار میں محصور رہتی ہے۔ ملازمت پیشہ کئی خواتین ہیراسمنٹ کا زیادہ سامنا کرتی نظر آتی ہیں۔ایک تو وہ تمام دن تھکا دینے والی ملازمت کرتی ہیں اور واپسی پر مشکوک نظروں کا استقبال' مینٹل ٹارچر اُن کے اعصاب کو ناکارہ بنا دیتا ہے۔کیا کبھی کسی نے جسارت کی کہ جان سکیں کہ ایسے الفاظ بیوی کے لیے ہی کیوں استعمال ہوتے ہیں؟ کیا دوسرے رشتوں کے لیے شک کے معاملات ممنوع ہیں؟ وہ کونسے عوامل ہیں جو مرد کو فقط ایک رشتے کی دوسرے رشتے میں تبدیلی سے لمحے بھر میں جابر و بے حس بنا دیتے ہیں۔

میرے نزدیک ان کی ابتداء ہمارے اپنے گھروں سے ہی ہوتی ہے۔ ہمارے معاشرے کی یہ خود ساختہ روش ہے کہ بیوی پاؤں کی جوتی ہے ایک اتارو دوسری پہنو' تیسری پہنو' چوتھی پہنو اور پھر جتنی چاہو تبدیل کرتے رہو۔اسے مرد کا حق سمجھا جاتا ہے مگر آج تک کسی نے اس حق کے استعمال کی تہہ تک پہنچنے کی سعی نہیں کی۔ انتہا ہے چشم پوشی کی۔ یہی وہ وجوہات ہیں جو طلاق و خلع جیسے اقدامات کا موجب بنتی ہیں۔خاص طور پر نوجوان نسل شادی کے نام سے خوفزدہ دکھائی دیتی ہے۔وہ آئے روز ہر چینل پر ان ناانصافیوں کا مشاہدہ کرتی دکھائی دیتی ہیں اور اس سے بچنے کے لئے وہ شادی نہ کرنے اور پڑھائی کے بعد نوکری کرنے کو ہی اپنی جائے پناہ سمجھتی ہیں۔عورت سے مرد کا غیر مساوی سلوک مادر پدر آزاد معاشرے کو مظبوط بنیادیں فراہم کر رہا ہے' نسلِ نو رنگینیوں میں

سکونِ قلب کی متلاشی پائی جارہی ہے۔ یہ قدم انہیں مذہب سے دور اور بیگانہ کررہا ہے۔

بحیثیت ایک زندہ قوم ہمارا فریضہ ہے کہ مستحکم و پرامن معاشرے کے قیام کی خاطر ٹھوس بنیادوں پر نہ صرف سوچا جائے بلکہ عاقبت سنوارنے کے لیے عملی اقدام بھی کیے جائیں کیونکہ ہمارے دین اسلام میں بھی اپنی بیویوں سے حسنِ سلوک سے پیش آنے کا حکم ہے۔ آیئے اس احسن فعل کی ابتداء اپنے گھروں سے کریں۔ ساس اپنی بہو کو نہ صرف بیٹی سمجھے بلکہ اس سے سلوک بھی بیٹیوں والا روا رکھے اور بہو بھی ساس کا احترام اپنی ماں جیسا کرے۔ اُسے بیٹیوں جیسا پیار دے' دوسری جانب خاوند بھی اپنی ماں بہن کی خوشی کی خاطر بیوی پر جابرانہ رویہ ختم کریں ورنہ یہ ناسور کینسر کی طرح ہماری نسلوں کو چاٹ کھا جائے گا اور دین و دُنیا میں فساد کا باعث بنے گا۔ اعصابی تناؤ کا شکار بیوی معزور بچوں کو جنم دے گی اور پھر سے زمانہ جاہلیت کے دور دورے کے خطرات منڈلاتے دکھائی دیں گے۔ ابتداء یقیناً بڑوں کو ہی کرنی پڑے گی' اس لیے مائیں جب بیٹوں کو بیویوں کے ساتھ حسن سلوک کا درس دیں گی تو کیسے ہوسکتا ہے کہ بیٹا ماں کے حکم کو رد کرے کیونکہ جنت ماں کے قدموں تلے ہے' اس کا احترام ہر پڑھا لکھا اور ان پڑھ بیٹا بڑے اہتمام سے کرتا ہے۔ یہ بات بھی تحقیق شدہ ہے کہ عورت ہی عورت کا گھر بگاڑتی ہے۔ عورت کا خمیر پیار سے بنتا ہے' اسے ہر روپ میں پیار و شفقت دو' نتیجہ خوشحالی ہوگا۔ میاں بیوی ایک دوسرے کا لباس ہیں۔ انہیں تار تار ہونے سے بچانا میاں بیوی دونوں کی ذمہ داری ہے کیونکہ انہیں کوئی پیوند لگانے نہیں آئے گا۔

جہانزیب اکرم' SEECS

حاصل یا لاحاصل

انسان اپنی جسمانی دنیا میں آنے سے قبل روحانی دنیا میں بھی بسیرا کر چکا ہے اور اس دنیا کے بعد بھی ایک زندگی ہوگی جس پر بات کرنا فی الحال قبل از وقت ہوگا۔

روحانی زندگی' جسے عالم ارواح کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے جہاں سب نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ ''اے اللہ! تُو ہی ہمارا رب ہے'' اس دُنیا کا ہماری آج کی زندگی سے بہت گہرا تعلق ہے جسے بھلایا نہیں جا سکتا مگر افسوس کہ ہم سب اس بات کو فراموش کر بیٹھے ہیں۔ دونوں زندگیوں کے مابین تعلق کا اندازہ کچھ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ اکثر انسان کسی کو دیکھ کر محسوس کرتا ہے کہ میں اس شخص سے پہلے کہیں مل چکا ہوں مگر کافی سوچ بچار کے بعد اور ذہن پر دباؤ ڈالنے کے باوجود بھی نہیں جان پاتا کہ آخر میری

اس شخص سے ملاقات کہاں ہوئی ہے۔آخر انسان کے شعور یا لاشعور میں یہ بات کہاں سے آئی کہ وہ اُس شخص کو کہیں پہلے سے جانتا ہے۔یہ بات اور سوچ آخر ہر انسان کے بارے میں کیوں نہیں آتی؟ ہزاروں لوگوں سے روزانہ ملاقات ہوتی ہے مگر صرف چند لوگوں کے بارے میں ہی یہ گمان کیوں ہوتا ہے کہ وہ پہلے مل چکا ہے؟ اب اس کے جواب میں وہ خود کو بہت سی باتوں سے تسلی دے گا کہ شاید میری عقل کا فطور ہے یا پھر کوئی غلط فہمی ہے۔ہاں ہوسکتا ہے کہ یہ غلط فہمی ہو اگر یہ معاملہ صرف ایک انسان کے ساتھ پیش آیا ہو۔نہیں، یہ ایسی بات نہیں جسے نظر انداز کر دیا جائے۔

اب اگر تھوڑا غور کیا جائے تو پتا چلے گا کہ نہ ہی کسی عقل کا فطور ہے اور نہ ہی غلط فہمی۔وہ بیچارہ انسان اپنی جگہ درست ہے۔اس بات کی گنجائش کہیں زیادہ ہے کہ اگر وہ اسے جانتا بھی ہے اور اِس دُنیا میں کبھی اس سے ملا بھی نہیں تو پھر یہ سب کیا ماجرا ہے؟ بات پھر یہاں اُس روحانی زندگی کی آ جاتی ہے۔وہ روحانی زندگی جہاں بغیر جسم کے صرف روح تھی۔ممکن ہے کہ وہ دونوں روحانی دنیا میں شناسا ہوں مگر پھر جب اپنی اپنی قسمت کے ہاتھوں اپنے قید خانے (جسم۔منزل) تک پہنچے تو سب یادیں کہیں دب کے رہ گئیں۔

کون کہتا ہے کہ عشق جرم ہے۔ہاں کوئی صحیح بھی کہہ سکتا ہے۔مگر جب عشق خود بخود انسانی خیالوں کی زنجیر توڑ کر اپنے آپے سے باہر ہو کر ہو جائے تو قصوروار کسے ٹھہرایا جائے؟ بعض اوقات عشق میں یوں بھی ہوا ہے کہ اپنی منزل (کسی انسان) کو صرف ایک ہی نظر دیکھنے سے انسان اپنے حواس کھو بیٹھتا ہے۔یہ جذبہ، جسمانی خواہش کی بجائے ایک اور نہ فنا ہونے والی چیز سے عشق کا جذبہ ہوتا ہے۔پہلی نظر میں ہی اندر سے آواز آتی ہے کہ بس میری تلاش مکمل ہوگئی۔عقل انسانی بھی میدان میں کود پڑتی ہے اور اپنی بحث کا موضوع اس طرف کر لیتی ہے کہ بھئی یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی کی تلاش ایک ہی نظر میں پوری ہو جائے۔

بات پھر وہیں آ گئی۔جسمانی زندگی سے پچھلی زندگی یعنی روحانی دنیا میں ہوسکتا ہے کہ روح کسی کے عشق میں مبتلا ہو چکی ہو اور پھر جب جدائی کا سفر اس مٹی کے انسانی ڈھیر کی وجہ سے شروع ہوا تو وصل کا سمندر ہی لا محدود ہو گیا۔پھر اگر قسمت نے دونوں کو اس دنیا میں آمنے سامنے کر دیا تو دراصل روح میں اپنی چاہت کے حصول کے لیے بے چینی پیدا ہو گئی اور اس سارے ماجرے کا اثر روح اور معصوم سے انسانی جسم پر پڑا جسے علم بھی نہ تھا کہ اس کے ساتھ یہ کیا ہو رہا ہے، بغاوت اندر ہی سے ہو رہی ہے، اسے یہ کون بتائے؟

یہ روحانی تعلق کچھ یوں اثر انداز ہوتا ہے کہ انسان نہ چاہتے ہوئے بھی دوسرے کو محسوس کر سکتا ہے۔یہ ایسی بات ہے کہ شاید ذہن اسے تسلیم نہ کرے مگر حقیقت کچھ یوں ہی ہے۔روح کس قسم کا تعلق چاہتی ہے۔ظاہر ہے کہ اسے اپنی تکمیل کے لیے احساس ہی کافی ہے، مگر آخر روح اپنی تکمیل دوسری روح کے ذریعے سے کیوں محسوس کرتی ہے۔فرض کریں کہ دو نہایت اچھے دوست لمبے عرصے بعد بچھڑ کے ملیں تو ان کی گفتگو کا دائرہ زیادہ تر ماضی کی داستانوں سے ہی ہوگا اور اپنا ماضی یاد کر کے اپنے دل کو تسکین دیں گے۔روح کا حال بھی کچھ اس مثال سے مختلف نہیں، وہ اپنے ماضی کی یاد تازہ کرنے کے لیے بے تاب ہو جاتی ہے۔اب یہاں سے نئے سفر کا آغاز ہوتا ہے۔وہ عشق جو عشق مجازی تھا، اس کا رخ عشق حقیقی کی طرف منتقل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ویسے اس کا رخ تو تبھی تبدیل ہونا شروع ہو گیا تھا جب پہلی نظر کا سامنا ہوا تھا۔کونپل نکل آئی تھی اور اب پھول بننے کے مرحلے کی طرف رواں دواں تھی مگر پھول صرف

اُسی صورت میں بنے گی جب یا تو دونوں روحیں مل جائیں یا پھر ایک اپنی منزل سے پیچھے ہٹ جائے۔

وصل کی صورت میں اپنا ماضی تروتازہ کریں گی۔اُس وقت کو یاد کر کے خوش ہوں گی اور اسی اثناء میں اپنے خالق کو بھی زیرِ بحث لائیں گی تو انہیں احساس ہوگا کہ کیا وصل ہی ہمارا اصل مقصد تھا یا ابھی کچھ اور بھی حاصل کرنے کو ہے؟ اسی دوران انہیں محسوس ہوگا کہ ابھی تو منزل کی جانب پہلی سیڑھی کا آغاز ہوا ہے۔اور منزل ہے کیا؟ منزلِ مقصود ہے اپنے خالق کو پالینا۔اسی جدوجہد میں عشقِ حقیقی کے سمندر میں بھی پہلا قدم رکھ دیا۔

ہجر کی صورت میں ناکام روح اپنے خالق سے گِلہ کرتی ہے کہ تو نے مجھے اُس کے روبرو بھی کیا مگر اس کا دل بھی پھیر دیا۔آخر اس کے پیچھے کیا راز اور ماجرا ہے؟ ذرا سا غور کرنے کے بعد خیال آئے گا کہ شاید میرا خالق مجھے سیدھا ہی اپنے پاس بلا رہا ہے۔پہلی سیڑھی نظر تو آ رہی ہے مگر حقیقت میں ٹوٹی پھوٹی ہے اور خالق کی مرضی اس میں ہو کہ میرا بندہ ہر سیڑھی پر قدم رکھنے کی بجائے سیدھا مجھ سے تعلق قائم کرے۔یہ رستہ کافی کٹھن معلوم ہوتا ہے کیونکہ ایک تو ہجر کا درد نڈھال کیے دیتا ہے اور دوسری طرف اپنے خالق کو پانے کے لیے دشوار راستوں سے گزرنا پڑتا ہے۔خالق بھی اپنے بندے کو ایسے ہی بے آسرا نہیں چھوڑ دیتا بلکہ اس کی رہنمائی کرتا ہے تب کہیں جا کر انسان اپنی منزل تک اور روح اپنی منزلِ مقصود تک پہنچتی ہے۔

انعم زہرہ

محبت فاتحِ عالَم

پہلا منظر

وہ ایک کم گنجان آباد چھوٹا سا قصبہ تھا۔وہاں کی ہر چیز عام سی تھی۔لوگ جگہیں، چیزیں، گلیاں تنگ اور ناہموار، دُھول اڑاتی چند سڑکیں، کئی دہائیوں کا بوجھ اٹھائے چند عمر رسیدہ مکان۔وہاں کے لوگ ان عمارتوں سے بھی زیادہ عام تھے۔کاندھوں پہ غمِ روزگار کا بوجھ اٹھائے، خمیدہ کمر، لڑکھڑاتے قدموں سے چند لوگ، وحشتوں کے ہاتھوں بے حال چند لوگ جو علاقے کے واحد مزار کو رونق بخشے ہوئے تھے۔چند جوان، مضبوط مگر خوفزدہ لوگ۔تیز قدموں، صحیح سوچوں اور جھکی نظروں سے چلتی چند آدم زادیاں۔۔۔یہ اُس قصبے کا ہمیشہ سے رہنے والا چہرہ تھا۔ڈر اس کی بنیادوں میں شامل تھا۔رزق کا ڈر، عزت کا ڈر، موت کا ڈر، لوگوں کا ڈر اور سب سے بڑھ کر زندگی کا ڈر۔یہ سب انہیں اپنی مٹی سے ملا تھا۔

وہ اُسی قصبے میں پیدا ہوئی تھی۔اُنہی ڈری سہمی گلیوں میں پلی بڑھی۔

اُنہی سب لوگوں کی طرح خوفزدہ تھی مگر خوف سے اُسے گھٹن محسوس ہوتی۔ وہ اپنے آپ کو، اپنے تمام لوگوں کو اور اپنے قصبے کو اس ڈر سے رہائی دلانا چاہتی تھی مگر اُس کے راہ کی دیوار بھی وہی ڈر تھا۔ اس کے لیے واحد جائے سکون قصبے کا سب سے قدیم بڑ کا درخت اور اس کے قدموں میں بیٹھے شاید اس درخت سے بھی زیادہ قدیم ''نور بابا'' تھے۔

''بابا مجھے درختوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ جب بھی میں ان درختوں کے پاس سے گزر رہی ہوتی ہوں مجھے لگتا ہے کہ یہ سب میرے پیچھے چل پڑیں گے اور مجھے پکڑ لیں گے۔ بابا! درخت انسانوں کو کھا جاتے ہیں؟''

''نہیں بیٹی۔ ان سے خوفزدہ مت ہو، ان سے محبت کرو۔ ان سے اپنی محبت ان کی جڑوں میں ڈالو۔ محبت کا تم ایک بیج ڈالو گی اور اس کا پھل صدیوں کھاؤ گی۔ محبت کرو، محبت۔''

''بابا وہ مزار پر بیٹھنے والے لال آنکھوں والے لوگ مجھے بہت خوفزدہ کرتے ہیں۔ میں وہاں سے گزر نہیں پاتی۔ بابا لوگ آنکھوں سے مار ڈالتے ہیں؟ کوئی ان کے پاس کیوں نہیں جاتا؟''

''وہ دھتکارے ہوئے لوگ ہیں بیٹی۔ ان سے محبت کرو۔ ان کے پاس بیٹھو، ان سے سوال کرو۔ وہ قدرت کے راز تم پر افشا کر دیں گے۔ وہ بھی محبت کرتے ہیں، تم بھی محبت کرو۔ صرف محبت۔''

سال گزرتے گئے اور اسے اس کے ہر خوف کا جواب ''محبت'' ملتا رہا۔

''بابا محبت کیا ہے؟ یہ کیسے کی جاتی ہے؟ یہ ہر چیز پہ حاوی کیوں ہے؟''

''محبت معجزہ ہے بیٹی۔ اس کائنات کا سب سے بڑا معجزہ... محبت عصائے موسیٰؑ ہے، ہر خوف کے اژدھے کو نگلنے والی۔ محبت یدِ بیضا ہے، اپنی روشنی سے پوری دنیا کو منور کرنے والی۔ جس ذرے پر اس کی روشنی پڑتی ہے یہ اُسے نور کا منبع بنا دیتی ہے۔ محبت عیسیٰؑ نفس ہے، مردے زندہ کرنے والی۔ محبت آیتِ کریمہ ہے، مچھلی کے پیٹ سے زندہ نکالنے والی۔ محبت یوسفؑ کا کرتا ہے، آنکھوں کا نور لوٹانے والی۔ محبت ابراہیمؑ کا ایمان ہے۔ آگ کو گلزار بنانے والی۔ محبت اسماعیلؑ کی قربانی ہے، ابدی روایات قائم کرنے والی۔ محبت شق القمر ہے۔ محبت وقتِ عصر کا ٹھہراؤ ہے۔ محبت معراجِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ محبت باعثِ تخلیقِ کائنات ہے۔ محبت میرے مالک کی صفت ہے بیٹی۔

محبت کہتی ہے کوڑا پھینکنے والوں کی بھی تیمارداری کرو۔ محبت کہتی ہے بلند و بالا محلّات کے مالک ہو کر بھی فرش پر بیٹھو۔ محبت کہتی ہے اپنا گھر، اپنا مال یہاں تک کہ گھر میں موجود سوئی تک دے دو۔ محبت کہتی ہے بہتر قربان کرو۔ محبت کہتی ہے دل سے سلام پڑھو اس کا جواب تمہیں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود دیں گے۔ محبت کہتی ہے اے نبی کریمؐ! جب یہ لوگ اپنی جانوں پر ظلم کر لیں تو آپ کی بارگاہ میں حاضر ہو کے معافی طلب کریں اور اگر آپ بھی ان کی سفارش کر دیں تو میں (اللہ) بخشنے والا مہربان ہوں۔ محبت کہتی ہے ''میں'' کو بھول جاؤ۔ اُس کے بندوں میں رہو۔ دیتے جاؤ اور معاف کرتے جاؤ۔ محبت اپناؤ، باقی سب خسارہ ہے۔''

دوسرا منظر

یہ قصبہ روشنیوں کا نگر مشہور تھا۔ یہاں کے لوگ باوقار اور منور چہروں والے تھے۔ مضبوط قدموں والے قدآور نوجوان، سر اُٹھا کر چلنے والے اور چہروں پہ رونقیں لیے بزرگ، بڑی بڑی آنکھوں والی آدم زادیاں... ہر طرف پھیلی ہریالی، قدرت کے تمام رنگ لیے باغات، فلک بوس مگر سرنگوں عمارتیں، سب سے قدیم بڑ کا درخت اور اُس کے قدموں میں کچی مگر روشن قبر، روشنیاں، قہقہے، مسکراہٹیں، محبتیں!!!

انعم زھرہ

رٹّے کی اہمیّت

رٹّے کا پسِ منظر کچھ یوں ہے کہ ایک فردِ مظلوم و افسردہ ایک گوشۂ تنہائی میں بیٹھا فریاد کر رہا تھا' کہ اچانک اُس کی نظر اُسی گوشۂ تنہائی کے مقابل گوشۂ خوشحالی میں بیٹھے ایک فرد پہ پڑی۔ اُس شخص کے ہاتھوں میں 4 کلو وزنی کتاب' چہرے پہ بھاری بھرکم کلوگرام کا چشمہ اور پاس ہی کتابوں' ٹرافیوں' گولڈ میڈلز کا ڈھیر پڑا ہوا تھا لیکن اُس کی رنگت حیرت انگیز حد تک سُرخ تھی۔ سرخ ایک رنگ ہوتا ہے' جسے عام زبان میں ''رٹّا'' کہا جاتا ہے۔ اُس افسردہ شخص نے زندگی میں پہلی بار اتنی ساری ٹرافیوں' میڈلز اور کتابوں کا ڈھیر ایک ساتھ دیکھا' کیونکہ اس سے پہلے اُس نے ہمیشہ ایسی چیزیں فٹ بالز' بلّے یا ریکٹ شٹل کے ساتھ دیکھی تھیں۔ اِس نئے منظر کو دیکھ کر اُس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اُس کی اس سوالیہ نشان کی مانند صورت دیکھ کر پاس سے گزرتے شخص کے قدم رُکنے پر مجبور ہو گئے' اُس نے پوچھا:

''پائی تینوں کی ہویا؟ اینج کیوں بیٹھا ایں جیویں دس وچوں دس نمبر لے لیتے''

اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے اُس نے کہا:

''وہ سامنے کیا ہے؟''

دوسرے نے ہنس کے کہا:

''تینوں نہیں پتا؟ اوُ رٹّا' سی۔''

زبان کی ذرا سی لغزش نے 'رتّے' کو 'رٹّا' بنا دیا۔ تب سے لے کر آج تک جہاں بھی وزنی کتابوں اور میڈلز کو ساتھ دیکھا جاتا ہے اور ان کے ساتھ دنیا و مافیہا سے بے نیاز انسان نما کوئی مخلوق موجود ہو تو اُسے رٹّے کا نام دیا جاتا ہے۔

رٹّے کی اہمیت کا اندازہ شاید آپ اور ہم نہ کر سکیں لیکن اِس تجسّس انگیز موضوع کو مدّ نظر رکھتے ہوئے ہم نے اس کے بارے میں جاننے کا فیصلہ کر لیا۔ سر پہ کفن اور کمر پر ہتھیار باندھے' بزرگوں سے اپنی سلامتی کی دعائیں لے کر ہم ''رٹّا مشن'' کے لیے نکل پڑے۔ اس قدر تیاری کا مقصد محض یہ تھا کہ ہم نے تاریخ کی کتابوں میں کہیں پڑھا تھا کہ رٹّا لگانے والے لوگ بہت خونخوار ہوتے ہیں اور کتابوں کے علاوہ کسی کا پاس آنا برداشت نہیں کرتے۔ دل میں دعائیں تھیں کہ کاش کوئی ایسا بندہ یا بندی مل جائے تو شاید ہم بھی کچھ لکھنے کے قابل ہو جائیں۔ ہماری تلاش کو منزلِ مقصود بہت جلد مل گئی کیونکہ آپ یوای ٹی میں ہوں اور آپ کو قدم قدم پر تھپیڑے نہ ملیں' ایسا ہو نہیں سکتا۔

اِس مشن کے اختتام پہ ہمیں اپنی اہمیت کا اندازہ ہوا کہ یقیناً ہم جیسے ہی لوگ ہیں جو کمیاب ہوتے ہیں اور جنہیں دنیا ''گوہرِ نایاب'' کہتی ہے۔

خیر بات وہیں سے شروع کرتے ہیں جہاں چھوڑی تھی کہ ہاسٹل سے نکلتے ہی سامنے والے گراؤنڈ میں میری نظر ایک گٹھڑی پر پڑی جو کہ ہل بھی رہی تھی۔

سامنے سے جا کر دیکھا تو رٹّے پر لکھی گئی تاریخ میری نظروں کے

سامنے گھوم گئی۔ ایک عدد نازک اندام محترمہ صحت مند کتابوں کو گود میں لیے پڑھ رہی تھیں۔ ہم نے کلمۂ شہادت پڑھا اور کانپتے کانپتے تھوڑا سا پاس ہوئے اور اپنی سُریلی آواز میں محترمہ کو پکارا:

''بہن جی! ذرا سنیے۔''

جواب ندارد۔ آواز کا والیوم تھوڑا سا بڑھایا' پھر کہا:

''بہن جی؟ ذرا سنیے گا۔''

اس کے بعد گٹھڑی سے ایک عدد سر برآمد ہوا اور اُس پہ دو کی بجائے چار آنکھیں نمودار ہوئیں' جن میں موجود ہیبت کی تاب نہ لاتے ہوئے ہم نے آنکھیں بند کرلیں اور اپنی طرف آنے والے تیر و تفنگ کا انتظار کرنے لگے۔ دیر تک آواز نہ سنائی دینے پر ہم نے ڈرتے ڈرتے پہلے ایک آنکھ کھولی' پھر دوسری' دیکھا تو سر پھر خول میں غائب ہو چکا تھا۔

ہم نے کہیں سے سُنا تھا کہ ایسے لوگوں کے پاس وقت بالکل نہیں ہوتا۔ ہم ٹھہرے خدا ترس لوگ' سو محترمہ کے وقت کی اہمیت کا احساس کرتے ہوئے ہم نے ایک ہی سانس میں مندرجہ ذیل جملے ادا کیے (یاد رہے کہ ان جملوں کی ادائیگی کے لیے ہم باقاعدہ فریکوئنسی کی کیلکولیشنز کر کے گئے تھے کہ جو کسی بھی رٹّے باز کی فریکوئنسی کے برابر ہو):

''ہم اصل میں ایک مشہورِ زمانہ' فرزانہ' خوشحالانہ' ایکسٹینشانہ سوسائٹی کی طرف سے آئے ہیں۔ ہمارا مقصد محض یہ دریافت کرنا ہے کہ آپ کے اِس شب و روز کے عمل و ریاضت کی کیا اہمیت ہے''

جواباً اُنہوں نے ہمیں ایسی نظروں سے دیکھا کہ ہم نے سر جھکا لیا اور بولے: ''ہم ایسے ہی کہہ رہے تھے مُنہ سے پھسل گیا' ہم جا رہے ہیں' آپ جاری رکھیئے۔''

دلِ مردہ دل نہیں ہے' اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کُہن کا چارہ

ترا بحر پُرسکوں ہے' یہ سکُوں ہے یا فسوں ہے؟
نہ نہنگ ہے نہ طوفاں' نہ خرابیٔ کنارہ

تُو ضمیرِ آسماں سے ابھی آشنا نہیں ہے
نہیں بے قرار کرتا تجھے غمزۂ ستارہ

ترے نیستاں میں ڈالا مرے نغمۂ سحر نے
مری خاک پے سپر میں جو نہاں تھا اِک شرارہ

نظر آئے گا اسی کو یہ جہانِ دوش و فردا
جسے آ گئی میسّر مری شوخیٔ نظارہ

علامہ اقبالؒ

سر اُٹھانے پہ کیا دیکھا کہ ایک دانت پر مشتمل مسکراہٹ ہمارے سامنے تھی (جو کہ یقیناً ہماری دو سالہ واقفیت کا نتیجہ تھی) اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے ہم دوزانو ہو کر سر جھکا کر احتراماً بیٹھ گئے۔ محترمہ یوں متکلّم ہوئیں:

''رٹّا زندگی ہے۔ ایسی زندگی جو بہت کم مگر باہمت لوگوں کے حصّے میں لکھ دی گئی ہے۔ اگر آپ زندگی میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو اُس کی پہلی سیڑھی رٹّا ہے' اس لئے تو آج لوگ رٹّے کے دیوانے ہیں۔ رٹّے کے بغیر آپ پرچہ حل نہیں کر سکتے' رٹّے کے بغیر آپ کلاس کی ایوریج بڑھا کے آدھی سے زیادہ کلاس کو فیل نہیں کرا سکتے' رٹّے کے بغیر آپ اساتذہ کی نظروں میں اہمیّت حاصل نہیں کر سکتے' رٹّے کے بغیر آپ دوسروں پہ

رعب نہیں جھاڑ سکتے' رٹّے کے بغیر آپ مشہور نہیں ہو سکتے' رٹّے کے بغیر آپ دعائیں نہیں لے سکتے یہ اور بات کہ وہ ''بد'' ہوتی ہیں۔ قصّہ مختصر' رٹّا ہے تو سب کچھ ہے' رٹّا نہیں تو ہم نہیں اور ہم نہیں تو کچھ بھی نہیں۔''

یقین کیجئے یہ جملے اُنہوں نے 30 سیکنڈ میں ادا کیے (شاید اِنہیں بھی رٹّا ہوا تھا) اِس لیے ہم پہلے سے ہی ریکارڈر کا بندوبست کر کے گئے تھے اور بعد میں سلوموشن میں لگا کر یہ سمجھنے کا شرف حاصل کیا۔ بہرحال اُن کے خوشگوار مُوڈ کو مدّنظر رکھتے ہوئے ہم نے کہا: ''اور کچھ بتایئے نا''

اُس وقت ہم بھول گئے تھے کہ ہم ایک تھیٹی کے 30 سیکنڈ لے چکے ہیں۔ جواب میں ہمیں سامنا کرنا پڑا ایک چیختی چنگھاڑتی آواز کا' جس سے گالیوں کی بجائے مساوات اور فارمولوں کا طوفان نکل پڑا۔ اِس سے پہلے کہ ہم اُن محترمہ کے گردونواح میں پھیلی کتابوں سے زخمی ہوتے' ہم اپنی نادیدہ دُم دبا کر ہاسٹل کی طرف بھاگے اور رٹّے کی اتنی اہمیت پتا چل جانے پہ ہی اکتفا کیا' اور فوراً نوافل حاجات پڑھ کر ایسی کسی مخلوق کا دوبارہ سامنا نہ ہونے کی دعا کی جو کہ اِن شاءاللہ قبول ہوگی۔

.....

سارہ سُلطانہ' SEECS

پھر سے وہ ہو گیا جس کا ڈر تھا!

جھوٹ سے مجھے نفرت ہے اور سچ سے مجھے پیار (یہ اور بات ہے کہ سچے لوگ مجھے زہر لگتے ہیں' خصوصاً جب اُن کا سچ میری کوتاہیوں سے متعلق ہو)

سادگی میری دوست ہے (تھی) اور فیشن سے مجھے بیر تھا

(جب تک اُس تک رسائی نہ تھی)

چنانچہ زبان کے چٹخارے کی خاطر سب ''فیشن زدہ'' لوگوں پر بیان داغنا میری پارٹ ٹائم جاب تھی (ہے)

سٹیفن کووی کو پڑھ کر مجھے مثبت سوچ کی اور بھی عادت ہوگئی جبکہ منفی سوچ رکھنے والے دوستوں کو لتاڑنا میں نے نہ چھوڑا۔

پھر یوں ہوا کہ رفتہ رفتہ جس کی بُرائی کرتی تھی' اُن کی ''خوبیاں'' مجھ میں آ گئیں۔ کیا معلوم آج وہ سب جن کی میں نے بُرائی کی تھی اُنہی کاموں میں ''ملوث'' ہوں یا نہ ہوں مگر مجھے رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا: ''تم لوگوں کی خامیاں چھپاؤ' اللہ روزِ قیامت تمہاری خامیاں چھپائے گا۔''

تو اس کی ایک توجیہ یہ بھی ہے شاید کہ تم دوسروں کی بُرائی کرو گے تو ضرور وہ تم میں ظاہر ہو کر رہے گی۔

سو' آج جب کسی اور کو دیکھتی ہوں کہ دوسروں کے فیشن یا اعتماد کی کمی یا کسی اور چیز پر فقرہ چُست کر رہا ہے / رہی ہے تو۔۔۔ کانپ کر رہ جاتی ہوں۔۔۔ (آپ کو معلوم ہی ہے غیر ضروری ردعمل) اور سوچتی ہوں کہ وہی نہ ہو جائے جس کا ڈر تھا۔

''میں'' سے ''وہ'' ہونے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔

صفدر علی (ایس سی ایم ای)

کھٹی میٹھی باتیں

محاورہ کسی بھی زبان کے حسن کا مظہر ہوتا ہے بلکہ ایک ایسا ٹوٹکا ہوتا ہے جس سے آپ کسی بھی دریا کو کوزے میں بند کر سکتے ہیں لیکن عملاً ایسا نہ کر بیٹھئے گا یہ نہ ہو کہ آپ خود ہی کوزے کے ساتھ دریا میں گر جائیں اور مجھے کوسنے کا موقع بھی کھو ڈالیں۔

ہمارے کچھ محاوراتی نسخے اتنے ہی مستند ہیں جیسے نیوٹن کے قوانین۔ جس طرح ہر انسان کو ''اپنا کام اور دوسرے کی تنخواہ زیادہ لگتی ہے'' ویسے ہی میں نے آج تک ایسی عورت شاید ہی دیکھی ہو جس کو اپنے خاوند کے عقلمند ہونے کا یقین ہو۔ حتیٰ کہ بڑے بڑے پڑھے لکھے یا فراڈیے کی بیوی کو بھی میں نے اپنے خاوند کو اللہ میاں کی گائے کہتے سُنا ہے۔

میں نے اَپنی آنکھوں سے ایک شوہر نامدار کو پٹتے ہوئے دیکھا' لیکن اُس کی ساس بضد تھی کہ کچھ تو قصور اِس لڑکے کا بھی ہوگا' دیکھیں بھائی تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے جو انہوں نے باقاعدہ بجا کر دکھائی اور پھر میری تائید چاہی۔ میں نے جان کی امان چاہتے ہوئے کہا کہ مجھے اِس بات کا یقین آ گیا ہے کہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے لیکن دونوں ہاتھ بھی تو آپ کے تھے۔ آپ نے کسی اور کو تو نہیں کہا کہ ذرا میری طرف ہاتھ بڑھائیں کہ میں تالی بجانا چاہتی ہوں آپ اس محاورہ کی خوبی دیکھیں آج تک یہ حربہ اپنی بلا دوسرے کے گلے ڈالنے کے لئے کس خوبصورتی سے استعمال ہو رہا ہے۔

اِسی طرح کا ایک اور محاورہ ہے: آسمان سے گرا کھجور میں اَٹکا۔ اب اِن عقلمند لوگوں سے بندہ پوچھے کہ جہاں کھجور کے درخت بھی نہ ہوں وہاں لوگ کہاں اَٹکیں گے۔ یعنی وہاں پر اگر کسی کو آسمان سے گرنا ہو تو وہ پہلے کھجور کا بندوبست کرے یا اس سے پہلے اپنا محاورہ بدل لے۔ بھلے مانس کو آسمان پر چڑھنے کی کیا ضرورت ہے اور اگر چڑھ ہی گئے تو وہاں سے گرنے کی کیا پڑی' وہیں اَٹکے رہو۔ آخر تو وہیں جانا ہے۔

اِسی طرح ایک اُردو اور انگریزی کا مشترکہ محاورہ بھی ہے ''بھونکنے والے کاٹا نہیں کرتے'' یا ''گرجتے ہیں جو وہ برستے نہیں'' مگر اس کے باوجود کئی دفعہ بھونکنے والے کُتے کو کاٹتے بھی دیکھا لیکن کچھ نہ کر سکے اُسے لاکھ بتایا کہ تم نے بھونک لیا ہے اب کاٹ نہیں سکتے مگر وہ صاف مُکر گیا کہ محاورہ تمہارا ہے' میرا نہیں۔

گرجتے بادل کو برستے دیکھا بلکہ بڑے بڑے اولے برساتے دیکھا لہٰذا ان محاوروں کا حال بھی اُسی چوکیدار جیسا نکلا جو پہرہ دیتے ہوئے کہہ رہا ہوتا ہے ''جاگتے رہنا' میرے پہ نہ رہنا''۔ لہٰذا محاورے کا استعمال بھی اپنی عقل سے کرنا' محاورے پہ نہ رہنا۔

ہمارے ہاں یونیورسٹیوں کے طالب علم بھی محاورتاً نہیں حقیقتاً فیس بک میں پھنسے ہوئے ہیں اور جس انہماک سے وہ ساری رات فیس بک گردی کرتے ہیں اور صبح کلاس میں لیٹ آتے ہیں اِسی طرح یونیورسٹی میں ردّی ڈالنے کا بیڑہ بھی انہوں نے اُٹھا رکھا ہے۔

مخدوم محمد شہاب الدین، NICE

گھونسلا

''چُوں چُوں چُوں''۔ روشن دان سے چھن کر آتی سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی روشن دان میں بنے چڑیا کے گھونسلے سے آواز آئی تو نجمہ بے اختیار خوشی سے اچھل پڑی کیونکہ نجمہ نے چڑیا کو تنکا تنکا اکٹھا کرتے دیکھا تھا۔ نجمہ نے اپنی چونچ میں دبائے ایک ایک تنکا چُن کر لاتی چڑیا کے حوصلے اور عزم کو کتنا سراہا تھا۔ تنکا تنکا چن کر آشیانہ بنایا اور اب اس آشیانے میں ایک نئی زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی اور نجمہ خوشی سے نہال تھی۔ اسی خوشی میں اس نے ناشتہ تیار کیا اور جمیل کو آفس جانے کے لیے جگایا۔ جمیل اس کا اکلوتا بیٹا ہے اور اس کی آرزوؤں اور ارمانوں کا مرکز بھی۔ ناشتے کی میز پر اس نے یہ خوشخبری سنائی۔ وہ کس قدر خوش تھی۔

اب اس کے روزمرہ کے معمولات میں چڑیا کی مصروفیت کو دل جمعی سے دیکھنا شامل ہو گیا تھا۔ وہ بڑی دلچسپی سے چڑیا کو دانا دانا لاتے دیکھتی اور گھونسلے میں مچلتے چوں چوں کرتے چڑیا کے بچے بے تابی سے منہ کھولتے اور اپنا رزق وصول کرتے۔ رفتہ رفتہ گرمیوں کی تپتی دوپہریں برسات کی مہکتی شاموں میں بدلیں اور پھر ان کی جگہ خزاں کی خنک راتوں نے لے لی۔ چڑیا کے بچوں کے پر نکل آئے تھے اور وہ چھوٹی چھوٹی اڑان بھرنے لگے تھے۔ سوچتے سوچتے نجمہ ماضی میں جا پہنچی۔

کس قدر غمگین تھی وہ کالی سیاہ رات! لگتا تھا سب کچھ ختم ہو چکا ہے، زندگی ویران اور بے مقصد لگتی تھی، جب اس کے شوہر جاوید کی حادثاتی موت کی خبر اسے ملی تھی۔ تین دن تک تو وہ سکتے کی حالت میں رہی تھی اور چوتھے دن جب اس کے ہوش و حواس قابو میں آئے تو جو سب سے پہلی آواز اس کے کانوں میں پڑی، وہ اس کے لختِ جگر جمیل کے رونے کی تھی۔ وہ تڑپ کر اٹھی اور اپنے جگر گوشے کو سینے سے لگا کر بلک بلک کر روئی۔ پس اس دن اس نے اپنی زندگی کا مقصد جان لیا تھا۔ جمیل کی پرورش میں اس نے رات دِن ایک کر دیا تھا اور اسے ماں اور باپ بن کر پالا تھا۔ اسے بہترین سکول میں تعلیم دلوائی تھی اور ذریعۂ معاش اس کی سکول کی جاب تھی جو جاوید کی موت کے بعد اس نے اپنی تعلیم کے بل بوتے پر حاصل کی تھی۔

گھنٹی کی آواز نے اسے جھنجوڑ کر ماضی سے حال میں لا کھڑا کیا تھا۔ گھڑی پر دیکھا تو فوراً سمجھ گئی کہ جمیل آ گیا ہے۔ دل چاہا کہ ویسے ہی پہلے کی طرح جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولے... مگر... اب بہار سے خزاں کے آنے میں بہت کچھ خزاں ہو چکا تھا۔ اب حالات بدل چکے تھے۔ نہ تو اس میں اتنی ہمت تھی کہ اپنے بستر سے اٹھ کر بیٹے سے ملنے جائے، اور نہ جمیل کے پاس ماں کے کمرے میں آنے کی فرصت تھی۔ جمیل، عالیہ اور بچے کھانے کی میز پر بیٹھ گئے اور اس کے لیے نوکر کے ہاتھ ٹرے میں کچھ بھجوا دیا گیا۔ ڈھلتی عمر نے اسے بہت کمزور کر دیا تھا۔ اور ساتھ ہی گھر والوں کے دل بھی اس سے بھر گئے تھے۔ ماں کو ہر وقت خدمت کی

ضرورت تھی۔مگر آج کل کی مصروف زندگی میں اتنا وقت کس کے پاس تھا؟ بیٹا' بہو' بچے سبھی کے اپنے مشاغل تھے۔وہ کرتی تو کیا کرتی اور دکھ کہتی تو کس سے کہتی!

پھر ایک دن جمیل اور عالیہ اس کے کمرے میں آئے۔انہیں دیکھ کر بے اختیار خوشی اس کے چہرے پر پھیل گئی۔مگر یہ کیا! وہ تو اس کے لیے یہ خبر لائے تھے کہ اب اس کی ''بہتر دیکھ بھال'' کے لیے اسے اولڈ ہوم میں شفٹ کیا جا رہا ہے اور یہ کہ وہ فکر نہ کرے' وہ لوگ اس سے ملنے آتے رہیں گے۔

الغرض زندگی کے اس کنارے پر جب نقاہت کے باعث اس کا جسم بھی اسے سہارا دینے کے قابل نہ تھا اور اسے سہارے کے لیے بیساکھی کی ضرورت تھی' اس کا سب سے مضبوط سہارا اس کا جمیل بھی اس سے چھن گیا۔جاوید کی رحلت کے بعد اس نے جمیل کے سہارے زندگی گزار لی تھی' مگر اب وہ کس کے سہارے جیتی! اسے یوں لگا جیسے اس کی بیساکھی بھی کسی نے چھین لی ہو۔اسے ایک دم اُس چڑیا کا خیال آیا اور اس پر رشک کرنے لگی۔چڑیا کے پاس تو اپنا گھر تھا۔اس کا گھونسلا اس کی جنت تھی جہاں ہر شام مغرب کی اذان کے ساتھ ہی وہ اطمینان سے لوٹ آتی تھی۔مگر نجمہ لوٹ کر کہاں جاتی۔اس کے پاس تو اپنا گھونسلا بھی نہ تھا۔

مگر اسے ابھی بھی ''اولڈ ہوم'' کے اس کمرے میں اپنے جمیل کا انتظار تھا۔شاید کبھی نہ ختم ہونے والا انتظار۔لیکن چڑیا شاید اب بھی اس سے بہتر تھی۔چڑیا کے بچے بھی پر نکلنے پر اڑ کر اپنی منزلوں تک جا پہنچے تھے' مگر چڑیا کے پاس انتظار کے لیے اپنا گھونسلا تھا۔نجمہ کے پاس تو انتظار کے سوا کچھ نہ تھا۔گھونسلے کی آغوش اور جو سکون چڑیا کو میسر تھا' نجمہ اس سے محروم تھی۔اولڈ ہوم اس کے پاس تھا اور گھونسلا چڑیا کے۔

دُنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہُوں یا رب
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکُوت جس پر تقریر بھی فدا ہو

مرتا ہُوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو

آزاد فکر سے ہُوں' عُزلت میں دن گزاروں
دنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو

لذت سرود کی ہو' چڑیوں کے چہچہوں میں
چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو

گُل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا
ساغر ذرا سا گویا مجھ کو جہاں نما ہو

ہو ہاتھ کا سرہانا' سبزہ کا ہو بچھونا
شرمائے جس سے جلوت' خلوت میں وہ ادا ہو

مانوس اس قدر ہو صورت سے میری بلبل
ننھے سے دل میں اس کے کھٹکا نہ کچھ مرا ہو

صف باندھے دونوں جانب بُوٹے ہرے ہرے ہوں
ندّی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو

راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دَم
اُمیّد ان کی میرا ٹُوٹا ہوا دِیا ہو

بجلی چمک کے اُن کو کُٹیا مِری دِکھا دے
جب آسماں پہ ہر سُو بادل گھِرا ہُوا ہو

اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے
تاروں کے قافلے کو میری صدا دَرا ہو

ہر درد مند دل کو رونا مِرا رُلا دے
بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگا دے

—— علامہ اقبالؒ

اسلم بزمی، SEECS

حمد باری تعالیٰ

تیرے دھیان سے جو جُدا ہوئے
وہی لمحے مجھ پہ بَلا ہوئے

ہیں وہ دونوں جہاں میں سرخرو
وہ جو دیں پہ تیرے فدا ہوئے

میں جو تیری راہ پہ چَل پڑا
میرے جتنے دکھ تھے ، ہوا ہوئے

تیرا رحم ہو تو ادا ہوں سب
وہ جو میرے سجدے قضا ہوئے

تیرے خیال سے جو غافل ہوا
میرے سب نشانے خطا ہوئے

محمد عثمان اختر، این آئی سی ای

نماز

روکتی ہے کارِ فُحش و بد سے بس خُوئے نماز
سُوئے جنت چلتا ہے، چلتا ہے جو سُوئے نماز
خیمہ زن مومن جہاں میں ہستیٔ خالق سے ہے
اس جہاں میں آب و رنگ و گل اسی مالک سے ہے
اس خدا کی رحمتوں کا قرضِ لازم ہے نماز
ہر مسلماں مرد و زن پر فرضِ لازم ہے نماز
شان تیری دین سے ہے، دین تُو ایمان تُو
بے عمل ہے گر تو پھر ہے ہستی بے جان تُو
دین و ایماں کو بقاء حاصل آوازِ حق سے ہے
ہستیٔ بے جاں کو جاں حاصل نمازِ حق سے ہے
ہر نفع نقصان سے، بزم و رَزَم سے پیشتر
حلقۂ احباب سے، فرحت سے، غم سے پیشتر
بابِ رحمت کو جو کر دیتی ہے وا، وہ ہے نماز
ہر مَرَض کو بخشتی ہے جو دوا، وہ ہے نماز
دیکھتا ہُوں دُور سے ہی کر کے دل میں آرزو
راہِ حق پہ گام زن مسلم ہو، ہو کے باوضو

ہم قدم ہوں، ہم صف آرا ہم زباں ہوں، ہم آواز
بے سمجھ ہے اہلِ دیں گر ہے یہی لطفِ نماز
ہستیٔ مومن جہاں میں آج کیوں ہے بے نقاب
بے نمازی بن گیا جو چھوڑ کر راہِ کتاب
راہِ حق پہ گامزن کرتی ہے مومن کو نماز
اس قدر نزدیکِ رب رکھتی ہے مومن کو نماز
یاس کو کرتی ہے آس اور بے خبر کو باخبر
عام کو کرتی ہے خاص اور بے صبر کو باصبر
بے فکر کو فکر آرا کرتی ہے فکرِ نماز
قفلِ لب کو نغمہ آرا کرتا ہے ذکرِ نماز
ہے تغافل دینِ حق سے روز بڑھتا جا رہا
اور مسلم اپنی راہ سے دُور ہوتا جا رہا
کرتا ہے مایوس مجھ کو ان کا یہ طرزِ رہن
پھر بھی جلتی ہے مرے دل میں امیدوں کی کِرن
سجدۂ آدم کو ملتا ہے انعام ہم کو نماز
کرتی ہے اُس ذاتِ حق سے ہمکلام ہم کو نماز
قلبِ دیں ہے، قلبِ مسلم کی صدا کا ساز ہے
اس میں پوشیدہ خدائے لم یزل کا راز ہے
بختِ خوابیدہ سے تیرے سخن آرا ہے نماز
آتشِ عشقِ ربی کو اک شرارا ہے نماز

محمد فراز (ایم سی ایس)

ٹریننگ لائف

وہ صبح کا فالن اور بی ایچ ایم کا ویٹ
وہ پی ٹی کی ٹینشن پھر بعد میں پریڈ
وہ سامنے سلام اور ہاتھ نیچے آنا لیٹ
وہ باز وفنگ اور داہنے دیکھ
وہ جی سی بل کٹنگ کی ٹینشن اور پیسوں کا ویسٹ
وہ پڑھے بغیر ٹیسٹ دینا اور نمبر ایٹی ایٹ (88)
وہ نائٹ پاس کی مستی اور کمپنی کا گیٹ
اس لیے تو کہتے ہیں ٹریننگ لائف اِز گریٹ

اے میرے دِلِ ناداں

اے میرے نادان دل
خواہشوں کے پرستار دل
گرتی کلیوں کے ہمنوا دل
رہتا ہے کیوں بے تاب تاروں کو چھونے کے لیے
امید جاوداں رکھ
تسلسل پیہم رواں رکھ
گھبراتا ہے کیوں زمانے کی آندھیوں سے
نگاہ دوراندیشی سے جھٹلا دے خوف اسیری کو
عنایات رب کو یاد رکھ
یقین کامل سے گرا دے ستون ناکامی کو
خودی کو برسرِ کار لا
نہ ڈگمگا نہ ٹھہر جا
اے میرے نادان دل

عماد الدین اظہر (ایم سی ایس)

اُف یہ پڑھائی

خدا ہم کو ایسی پڑھائی نہ دے
کتابوں میں کچھ جب دکھائی نہ دے

کرو نیند پوری یہ پروا نہیں
کہ ٹیچر کا لیکچر سُنائی نہ دے

جو دیں خالی پیپر تو ٹیچر کہے
اب اتنی زیادہ صفائی نہ دے

فزکس آ سکی اور نہ انگلش مجھے
ریاضی میں کچھ بھی سُجھائی نہ دے

خطاوار سمجھے گا ہر اک تجھے
تو اتنی زیادہ دُہائی نہ دے

کتاب ایسے احساس کا نام ہے
کہ ہو سامنے اور دکھائی نہ دے

محمد حمزہ سُہیل (ایم سی ایس)

ماں

پھولوں کی خوشبوتُو ہے

دھوپ میں سائے کی مانندتُو ہے

مشکلوں میں مددگارتُو ہے

ہمارے لیے دعا گوتُو ہے

پاؤں تلے جس کے ہے جنت

وہ عظیم شخصیت تو ہے

عیاں ہو جس سے محبت

وہ شفاف آئینہ تُو ہے

پہاڑوں سے ہے جس کا اونچا مقام

وہ عظیم شخصیت تو ہے

صحرا میں پانی کی مانند تو ہے

بیماری میں شفاء کی مانند تو ہے

این سی محمد ثقلین (ایم سی ایس)

حقیقی کامیابی کا پیغام

عشقِ محمدﷺ کا دیا دل میں جلائے رکھنا
اپنے ماتھے پہ غلامی کا جھومر سجائے رکھنا
مرقد میں بھی لب پہ ترانہ ہو محبت کا
عمر بھر اُنؐ سے محبت ایسی نبھائے رکھنا
بنیاد ہے اُن کی محبت پر عمل شریعت میں یقیناً
ہر ممکن، ہر لحظہ اس حقیقت کو اپنائے رکھنا
عشقِ رسولﷺ، عرفانِ الٰہی کا پہلا سبق ہے
اس بات کو ہمیشہ اپنے دل میں جمائے رکھنا
کفر و شرک کی ظلمتوں سے نہ گھبرا اے نوجواں
دینِ محمدﷺ کا علم ہر آن اُٹھائے رکھنا
رب تعالیٰ نے رحمت کا دریا اُن کو ٹھہرا دیا
اپنے دامن کو اُن کے در پہ پھیلائے رکھنا
بندۂ مومن کا قلب ہے اُن کی محبت کا ٹھکانہ
نفس کی آلودگی کو دل سے مٹائے رکھنا
گر چاہتے ہو ہر امتحاں میں نصرت و کامرانی
اُن کے دیں سے لگن اپنی لگائے رکھنا
دنیا کی لذتیں کہیں گمراہ نہ کر دیں
قرآن و سنت کی شمع ہر دم جلائے رکھنا
یا رب صرف اتنی التجا ہے تیری بارگاہ میں
ہم سب کو محمدﷺ کا غلام تا عمر بنائے رکھنا

فرخ اقبل(پی این ای سی)

عہدِ وفا

مرے پاک وطن کی مٹی میں
اِک عجب سرور سا بستا ہے
اِک رُت نرالی لگتی ہے
اِک خواب سا پورا لگتا ہے
پت جھڑ کے موسم میں جیسے
اِک باغ سہانا لگتا ہے
یہ دھرتی پھول سی دھرتی ہے
ہر پھول شگفتہ لگتا ہے
اک خواب جو ہم نے دیکھا تھا
اک تدبیر کبھی جو سوچی تھی
وہ خون بہا جو دان کیا
جو سب کچھ لٹا کر مان لیا
وہ مُلک ہمارا اپنا تھا
وہ مُلک ہمارا اپنا ہے
یہ دھرتی پھول سی دھرتی ہے
ہر پھول شگفتہ لگتا ہے
اِک آس سجی ہے دامن میں
کچھ بانٹ سکوں اِس گلشن میں
میں تمثیلِ قندیل جلوں
پرنور رہو ہر ڈالی ڈالی
مرے مُلک کی مٹی سوندھی ہے
کُل گلشن پیارا لگتا ہے
یہ دھرتی پھول سی دھرتی ہے

سید شوزیب عباس، SEECS

حقیقت

اے ارض و سما سُن لو حقیقت کا فسانہ
کڑوا ہے مگر سچ یہ حقیقت کا فسانہ
آ جاؤ میرے دِل کے سمندر میں دیکھ لو
گر دل ہو کسی اور بشر کا ٹھکانہ
پھر چھوڑ جانا تم مجھے طوفان کی مانند
بن جائے سمندر میرا اُس غم کا ٹھکانہ
جس غم میں مبتلا تھا یہ اُس شام سے پہلے
جس شام سے قبل یہ زندگی تھی ویرانہ
ممکن نہیں خیال کسی اور کے ہوں ہم
گر ہو جائے خطا تو سزا مجھ کو دلانا
کر لو میرا یقین کہ ایسا نہیں ممکن
نہ بشر کی پہنچ ہے مجھے تم سے ہٹانا
مجھ کو فقط یقین ہے اُسی پاک ذات پر
جس نے کیا یہ کام دو دلوں کو ملانا
احسان بہادر پہ ہے اُس پاک ذات کا
جس نے مجھے نصیب کیا اُس کا ٹھکانہ

سعدیہ حسنین شاہ، سی لے ای

شہیدِ وطن

عظیم ماں! تیرے شہید کی دیکھ لاش آئی ہے

تھی جس چیز کی اُسے حسرت دیکھ وہ تلاش پائی ہے

بہت شوق تھا جسے دُلہا بنا دیکھنے کا تجھے

اُس کی بارات کو دیکھ کتنی بشاش آئی ہے

چھین کر محض اِس فانی و بے وفا دُنیا کو

بخشے جو ابدی حیات اُسے دیکھ خراش آئی ہے

دے کر جان امر کر دیا تا ابد اس نے خود کو

ہو جس چیز کی حسرت ہر کسی کو دیکھ وہ کاش آئی ہے

تو اُداس کیوں ہے ماں! تو جشن منا

نہ چرائی جا سکے تیرے گھر سے دیکھ وہ افلاس آئی ہے

محمد حسین فاروق شان، SEECS

وطن کی حفاظت

اس مردِ مجاہد کو چکانا تیرا قرضِ زندگانی ہے
اس وطن کی حفاظت میرا فرضِ زندگانی ہے

تیری مٹی پہ ہے پہرہ خدا کا نظرآتا ہے
ارض پاک پہ ہے چہرہ خدا کا نظر آتا ہے
تجھ سے رشتہ ہے گہرا خدا کا نظر آتا ہے
اڑنا تیری فضاؤں میں میرا طرزِ زندگانی ہے
اس وطن کی حفاظت میرا فرضِ زندگانی ہے

تیرے دریاؤں میں کوثر، زمیں میں مشک ہوتا ہے
عشق ہے تجھ سے وطن، تم ہی پہ رشک ہوتا ہے
وطن پہ خوں کا ہر قطرہ اور بہانا ہراشک ہوتا ہے
خوابِ قائد کا وطن ہی میرا غرضِ زندگانی ہے
اس وطن کی حفاظت میرا فرضِ زندگانی ہے

تیری عزت کے لئے حاضر ہے آن اپنی
تیری حرمت کے لئے دوں گا میں جان اپنی
تیری عظمت کے لئے مٹا دی ہے شان اپنی
تو ہے جینے کا سہارا، تو میرا مرضِ زندگانی ہے
اس وطن کی حفاظت میرا فرضِ زندگانی ہے

غازی تھا جو پالیا ہے رتبہ شہید کا
تاریکی سے نکلا ہے رستہ توحید کا
تجھی سے سیکھا ہے نغمہ امید کا
ہمیشہ رہے خدا وطن میرا ارض زندگانی ہے
اس وطن کی حفاظت میرا فرض زندگانی ہے

احسن وحید، SEECS

مجھ پر کچھ لکھو

وہ کہتا ہے
مجھ پر کچھ لکھو
کہ جس کو سننے پر
عقل و خرد پر پڑے
سب خس و خاشاک
پھونک جائیں
وہ کہتا ہے
مجھ پر کچھ لکھو
کوئی ایسی بحر
کہ جس کے آہنگ سے
دھڑکن کی سرگم میں
بھونچال آجائے
وہ کہتا ہے
یوں لگے کہ
لفظوں کے موتی
شعور کے جھومر سے اتر
سیاہی کی موجوں پر
بے سہارا کشتی کی مانند
ڈوبتے سورج کی طرف
گامزن ہوں
وہ کہتا ہے
مجھ پر کچھ لکھو
کچھ ایسا کہ
جب عمرِ رفتہ میں
کوئی ساتھ نہ ہوگا
اور روزگار کی چلن میں
وہ سب تصویریں
ماند پڑ جائیں گی
تو تھکی آواز
اور بھاری لہجے میں
میں پھر سے
اُس بے سہارا کشتی میں سوار
ڈوبتے سورج کی طرف
سفر کروں
وہ کہتا ہے
مجھ پر کچھ لکھو

نویرا طاھر (ایم سی ایس)

نظم

تہذیب وتمدن کی زنجیریں توڑتا چلا آ

اجداد کی جاگیریں چھوڑتا چلا آ

نہیں ہے تجھ میں کوئی اخلاص باقی

اے مسلماں! اخلاق کی تدبیریں موڑتا چلا آ

سیاہی مائل ہے حال ترا

مستقبل کی امیدیں چھوڑتا چلا آ

ڈھادی ہے علم کی دیوار

تو جاہلیت کی طرف دوڑتا چلا آ

بُھلا بیٹھا ہے تو اپنے وجود کی بنیاد

تو اپنی پہچان کو روندتا چلا آ

ابھی بھی وقت ہاتھ سے نکلا نہیں

تو اس کی ستائش ڈھونڈتا چلا آ

دروازے کھلے ہیں آمُرزِش کے ابھی

اپنے رب کی طرف دوڑتا چلا آ

مخدوم محمد شہاب الدین، NICE

غزل

وہ دستِ محبت اٹھا، وہ سائباں گیا
اک درد مجھ کو دے کر مرا مہرباں گیا

بزمِ سخن میں وہ مرا واحد تھا آسرا
میں کہہ نہ سکا سچ، تو مرا قدر داں گیا

ساحل پہ تھے تو شوخیِ و مستی تھی دیدنی
جب موج آئی بحر میں تو بادباں گیا

کہتا تھا وہ کہ چپ ہی رہو اب کی بار تم
میں رکھ نہ سکا راز اور رازداں گیا

فہد بن خالد، SEECS

غزل

کچھ غم کی نہیں بات یہ صدمات کا ہونا
ہے دن کی پیامی بھی یہی رات کا ہونا

دو چار قدم رکھ تو سہی جانبِ منزل
اُس ذات کے پھر دیکھ کمالات کا ہونا

پھر چشم فلک دیکھ کے حیران ہوئی ہے
سر خاک پہ رکھتے ہی کرامات کا ہونا

سو بار نظر ڈال تُو ہر ایک عمل پر
اک روز یقینی ہے مکافات کا ہونا

اس اشک فشانی سے فہد کچھ نہیں حاصل
دنیا کے لئے کافی ہے برسات کا ہونا